تعلیم و تربیت

دسمبر 2013ء

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

تعلیم و تربیت

73واں سال آٹھواں شمارہ

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

اس شمارے میں

اور بہت سے دل چسپ تراشے اور سلسلے

سرورق: یوم پیدائش قائداعظم محمد علی جناح

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

دُنیا میں ایسی تو بے شمار ہستیاں ہو گزری ہیں جنہوں نے تاریخ کے دھارے کو ایک نیا رُخ دیا لیکن قائداعظمؒ کو یہ فوقیت حاصل ہے کہ انہوں نے اپنی دلی لگن اور ان تھک محنت سے پاکستان کے حصول سے نہ صرف تاریخ میں ہی ایک نیا اور روشن باب شامل کیا بلکہ دُنیا کے جغرافیے میں بھی ایک نام کا اضافہ کیا۔

پیارے بچو! آج سے 137 سال پہلے 25 دسمبر کو ہمارے محبوب قائد محمد علی جناح پیدا ہوئے تھے۔ آپ کی ان تھک کوششوں سے اس برصغیر میں ایک نیا اسلامی ملک پاکستان قائم ہوا تھا اور ان شاء اللہ قیامت تک قائم رہے گا۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے قائد کی نصیحتوں اور ہدایتوں پر سچے دل سے عمل کر کے پاکستان کو عالمی برادری میں ایک عظیم ملک بنائیں۔

قائداعظم ایک نڈر، محبِ وطن اور ماہر قانون دان کے طور پر مشہور تھے۔ قائداعظم کی اسلام اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے عقیدت اور دلی لگاؤ کا یہ عالم تھا کہ اکتوبر1892ء میں لندن روانہ ہو کر وہاں قانون کی سب سے اہم درس گاہ "لنکنز اِن" میں داخلہ لیا تو کسی نے آپ سے دریافت کیا کہ تعلیم کے لیے آپ نے اس ادارے کا کیوں انتخاب کیا ہے۔ آپ نے جواب دیا کہ اس درس گاہ کے صدر دروازے پر دُنیا کے بڑے بڑے قانون سازوں کی فہرست میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک نام بھی لکھا ہوا ہے۔ ایک جگہ پر قائداعظم نے فرمایا:

"اس میں شک نہیں کہ ہم نے پاکستان حاصل کر لیا ہے لیکن یہ تو محض آغاز ہے۔ اب بڑی بڑی ذمہ داریاں ہمارے کندھوں پر آن پڑی ہیں اور جتنی بڑی ذمہ داریاں ہیں اتنا ہی بڑا ارادہ، اتنی ہی عظیم جدوجہد کا جذبہ ہم میں پیدا ہونا چاہیے۔ پاکستان حاصل کرنے کے لیے جو قربانیاں دی گئی ہیں، جو کوششیں کی گئیں، پاکستان کی تشکیل و تعمیر کے لیے بھی کم از کم اتنی قربانیوں اور کوششوں کی ضرورت پڑے گی۔ حقیقی معنوں میں ٹھوس کام کا وقت آ پہنچا ہے اور مجھے پورا پورا یقین ہے کہ مسلمانوں کی ذہانت و فطانت اس بارِ عظیم کو آسانی سے برداشت کر لے گی اور اس بظاہر پیچیدہ اور دشوار گزار راستے کی تمام مشکلات کو آسانی سے طے کر لے گی۔"

"جو لوگ اپنی نادانی سے یہ سمجھتے ہیں کہ وہ پاکستان کو ختم کر دیں گے، بڑی سخت بھول میں مبتلا ہیں۔ دُنیا کی کوئی طاقت پاکستان کا شیرازہ بکھیرنے میں کام یاب نہیں ہو سکتی۔ اس پاکستان کا جس کی جڑیں مضبوطی اور گہرائی کے ساتھ قائم کر دی گئیں ہیں۔ ہمارے دشمنوں کے ان خوابوں یا ارادوں کا طریقہ، جس کی وجہ سے وہ قتل اور خونریزی پر اُتر آئے ہیں، سوائے اس کے کچھ نہ نکلے گا کہ کچھ اور معصوم اور بے گناہ انسانوں کا خون ہو۔ یہ لوگ اپنی حرکتوں سے اپنے فرقہ کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ لگا رہے ہیں۔ مہذب اور متمدن دُنیا ان کے وحشیانہ طرزِ عمل کو نفرت کی نگاہ سے دیکھے گی۔ میں خدا سے دُعا کرتا ہوں کہ تو نے ہی یہ آزاد و خود مختار سلطنت ہمیں عطا کی ہے، تو ہی یہاں کے باشندوں کو مسائل و آلام برداشت کرنے کی ہمت دے اور صبر و استقلال عطا فرما اور انہیں یہ صلاحیت بھی دے کہ ہر قسم کے اشتعال کے باوجود وہ پاکستان کی خاطر اس کے امن و امان کو برقرار رکھنے میں کامیاب رہیں۔"

دسمبر کا یہ مہینہ اس لحاظ سے بھی بہت برکت والا ہے کہ اس مہینے کی 25 تاریخ کو اللہ تعالیٰ کے پیارے رسول اور عیسائی مذہب کے بانی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس دُنیا میں تشریف لائے تھے۔ عیسائی کمیونٹی اس تاریخ کو بڑی دھوم دھام سے کرسمس کا تہوار مناتے ہیں۔ تعلیم و تربیت کے عیسائی ساتھیوں کو یہ خوشبو بھرا تہوار مبارک ہو۔

اب اس ماہ کا رسالہ پڑھیے اور اپنی آراء اور تجاویز سے آگاہ کیجیے۔ خوش رہیں، شاد رہیں اور آباد رہیں۔

فی امان اللہ! (ایڈیٹر)

چیف ایڈیٹر	ایڈیٹر، پبلشر	اسسٹنٹ ایڈیٹر	مشیر	سرکولیشن اسسٹنٹ
عبد السلام	ظہیر سلام	عابدہ اصغر	سعید لخت	محمد بشیر راہی

سالانہ خریدار بننے کے لیے سال بھر کے شماروں کی قیمت پیشگی بنک ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت میں سرکولیشن منیجر: ماہنامہ "تعلیم و تربیت" 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور کے پتے پر ارسال فرمائیں۔

فون: 36361309-36361310 فیکس: 36278816

پرنٹر: ظہیر سلام

مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، لاہور۔

سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60 شاہراہ قائداعظم، لاہور۔

خط و کتابت کا پتا

ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور۔

AN: 042-111 62 62 62 Fax: 042-36278816

E-mail:tot.tarbiatfs@gmail.com

tot tarbiatfs@live com

پاکستان میں (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک)= 500 روپے۔

مشرق وسطیٰ (ہوائی ڈاک سے)= 2000 روپے۔

ایشیاء، افریقہ، یورپ (ہوائی ڈاک سے)= 2000 روپے۔

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، مشرق بعید (ہوائی ڈاک سے)= 2000 روپے۔

قیمت فی پرچہ: 25 روپے

حمد باری تعالیٰ

اے مالکِ دو عالم اے خالقِ یگانہ
کتنا عظیم ہے تری قدرت کا کارخانہ

مخلوق سے ہے تجھ کو اپنی پیار جتنا
پایا ہے اس سے بڑھ کر تجھے پھر بھی مہربانا

میں ہر مقام پر رہا تری بخششوں کا طالب
مجھے ہر مقام پر ملی تری نظرِ مشفقانہ

منزل تلاش کرنے میں بھٹکا ہوں میں جہاں بھی
بخشا عنایتوں نے تری عزمِ جاودانہ

جو اہلِ خیر ہیں انہیں جنت کی دی بشارت
دوزخ کو کر دیا ہے کفار کا ٹھکانا

لاکھوں درود بھیج کر محبوبِ دو جہاں پر
تشنہ رہا ہے پھر بھی مرا جذبِ عاشقانہ

قربان کیوں نہ جاؤں تری ہر ادا پہ مولا
اک اک ادا کا ٹھہرا ہے انداز دلبرانہ

''تری بندہ پروری سے مرے دن گزر رہے ہیں
نہ گلہ ہے دوستوں کا نہ شکایتِ زمانہ''

دیدار اپنے در کا کر دے نصیب آقا
رکھتا ہے دل میں خادم یہ شوق عاجزانہ

خادم بلاغوی

نعت رسول مقبولؐ

جو آپؐ بلا لیتے میری ذات بنی رہتی
اغیار کی محفل میں میری بات بنی رہتی

ساون میں میرے آقاؐ طیبہ نہ بلا لیتے
بن موسمی آنکھوں میں برسات بنی رہتی

سہرا جو سجا رہتا، انوارِ محمدؐ کا!
خوشیوں کی مرے گھر میں بارات بنی رہتی

ہم گنبد خضرا کے سائے میں رہے ہوتے
تیرے کرم کی آقاؐ بہتات بنی رہتی

خوابوں میں ہی آ جاتے، دل ہی میں سما جاتے
من میں مرے خوشیوں کی بارات بنی رہتی

نعلین کے سائے میں ہم کو بھی جگہ ملتی
شاہ جیؔ کی محبت بھی درجات بنی رہتی

سید شبیر احمد شاہ

راحت اور سکون کا سامان

محمد طیب الیاس

حضرت سالم بن ابی الجعد کہتے ہیں کہ ایک دن قبیلہ خزاعہ کا ایک آدمی کہنے لگا کہ ''کاش! میں نماز پڑھتا اور راحت پاتا۔'' لوگوں کو اس کی بات بُری لگی تو اس نے کہا کہ میں نے رسول اللہ کہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''بلال! نماز کے لیے تکبیر کہو تا کہ ہم اس کے ذریعے راحت حاصل کریں۔''

(ابوداؤد شریف، کتاب الادب، باب فی صلاۃ العتمۃ، حدیث:4985)

پیارے بچو! آیئے! پہلے اس حدیث کا مطلب معلوم کرتے ہیں۔

قبیلہ خزاعہ کے آدمی نے کہا۔ ''کاش! میں نماز پڑھتا اور راحت پاتا۔'' اس کا مطلب یہ تھا کہ میں چاہتا ہوں نماز پڑھوں اور اس میں اپنے رب تعالیٰ کی عبادت کروں۔ قرآن پاک کی تلاوت کروں، سبحان ربی العظیم، سبحان ربی الاعلیٰ (تسبیحات)، اللہ اکبر (تکبیرات) کہوں۔ اپنے پروردگار کی حمد و ثنا بیان کروں، درود شریف پڑھوں تا کہ ان سب چیزوں سے میرے دل کو اطمینان اور سکون ملے اور لذت و سرور حاصل ہو۔

لوگوں کو اس کی یہ بات کہ ''کاش! میں نماز پڑھتا اور راحت پاتا۔'' اس لیے بُری لگی کی وہ اس کا مطلب نہ سمجھ سکے تھے۔ وہ یہ سمجھے کہ یہ شخص نماز کو بوجھ سمجھتا ہے، اس لیے اس کو جیسے تیسے ادا کر کے خلاصی اور چھٹکارا پانا چاہتا ہے۔

قبیلہ خزاعہ کے اس شخص نے جب دیکھا کہ لوگ اس کی بات کو سمجھ نہیں سکے ہیں اور اس پر ناراضگی ظاہر کر رہے ہیں تو اس نے ان کو اپنی بات سمجھانے کے لیے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''بلال! نماز کے لیے تکبیر کہو تا کہ ہم اس کے ذریعے راحت حاصل کریں۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تو بس رب تعالیٰ کی عبادت میں ہی راحت تھی اور نماز میں مشغولیت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے آرام و سکون کا بڑا ذریعہ تھا کیوں کہ اس میں اللہ تعالیٰ سے مناجات ہوتی ہے۔ اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔''

(نسائی شریف، کتاب عشرۃ النساء، باب حب النساء، حدیث:3940)

نماز اسلام کے ارکان میں ایک اہم رکن ہے۔ ایمان کے بعد سب سے اہم چیز نماز ہے۔ قرآن پاک میں بہت سی جگہ نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم جب سفر معراج پر تشریف لے گئے تو ''نماز'' کا خصوصی تحفہ ملا۔ نماز سے اس مالک کا شکر بھی ادا ہوتا ہے جس کی نعمتیں ہم پر بے شمار ہیں۔ نماز ہی سے دنیا و آخرت کی تمام بھلائیاں اور سعادتیں حاصل ہوتی ہیں۔ قیامت کے دن پہلے نماز کے متعلق ہی سوال ہو گا لیکن یہ بات ضرور یاد رکھیں کہ نماز اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے اور عبادت انتہائی اطمینان، سکون اور عاجزی کے ساتھ ادا کی جاتی ہے۔ اس لیے جلدی جلدی نماز پڑھنا ''نیکی برباد گناہ لازم'' والی بات ہو گی۔ یعنی اس سے نماز میں اجر و ثواب میں کمی آجاتی ہے اور ایسی نماز قبولیت کے درجہ پر فائز نہیں ہو پاتی۔

اتنی اہم عبادت کو ادا کرنے میں ہمیں بالکل بھی سستی نہیں کرنی چاہیے۔ پانچ وقت کی نماز پابندی کے ساتھ ادا کرنی چاہیے۔ اللہ رب العزت نے وعدہ فرمایا ہے کہ ''ان لوگوں کے ساتھ جو نماز کی پابندی کرتے ہیں، ان کو اجر عظیم عطا فرمائے گا۔''

(النساء، آیت:162)

تو کیوں پیارے بچو! آپ نماز کی پابندی کریں گے نا؟

ان شاء اللہ تعالیٰ!

دیوالی کی رات

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک بادشاہ اپنے شان دار محل میں اپنی ملکہ کے ساتھ رہتا تھا۔ ملکہ خوب صورت تو تھی مگر بہت نک چڑی اور مغرور بھی۔ وہ ہر دیوالی کے تہوار پر بادشاہ سے بہت قیمتی تحائف کا تقاضا کیا کرتی اور ہر سال بادشاہ اس کی ہر خواہش پوری کرتا، چاہے اس کے لیے اسے کچھ بھی کرنا پڑے۔

ایک سال ملکہ نے بادشاہ سے ایک ایسے جڑاؤ ہار کی فرمائش کی جو سچے موتیوں سے آراستہ ہو۔ بادشاہ نے سچے موتیوں کی تلاش میں فوراً ہزاروں تیراک روانہ کر دیے تاکہ وہ سمندر کی تہہ چھان ماریں۔ تیراک انعام کے لالچ میں سمندر کا سینہ چیرتے رہے اور دیوالی سے پہلے بڑے بڑے سیپ ہاتھوں میں لیے دربار میں حاضر ہو گئے۔ ان سیپوں میں ملکہ کی مرضی کے مطابق شان دار سچے موتی تھے۔ بادشاہ نے بھی تیراکوں کی محنت سے بڑھ کر انہیں انعام و کرام سے نوازا۔ پھر اس نے ان موتیوں کو شاہی جوہری کے پاس بھیجا تاکہ دیوالی سے پہلے وہ اپنی ملکہ کی خواہش پوری کرتے ہوئے اس کی مرضی کا تحفہ دے۔

ملکہ نے ہار اپنے گلے میں پہنا تو خوشی سے اس کے گال تمتما رہے تھے۔ شیشے میں اپنے آپ کو دیکھ کر وہ خاصی دیر تک اتراتی رہی۔ ملکہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ روزانہ نہانے کے لیے دریا پر جاتی تھی۔ مدت سے اس کا یہی معمول تھا۔ ایک صبح اس نے نہانے کے لیے دریا کنارے پیراکی والے کپڑے پہنے اور قریب تھا کہ دریا میں ڈبکی لگاتی، اسے یاد آیا کہ اس کا موتیوں سے جڑا ہار اس نے ابھی تک گلے میں پہنا ہوا ہے۔ اس نے ہار اتار کر کپڑوں پر رکھا اور سہیلیوں کو اس کی حفاظت کا کہا اور خود پیراکی کرنے لگی۔ سہیلیاں اس کے کپڑوں کے نزدیک ہی بیٹھی تھیں مگر پھر ایسا واقعہ ہوا جو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ ایک کوا جو اس وقت قریبی درخت کی شاخ پر بیٹھا تھا، اس نے اچانک ہار اپنی چونچ میں

دبایا اور اسے لے کر نامعلوم سمت میں اُڑ گیا۔ جب ملکہ کو اس واقعہ کا علم ہوا تو ناراضگی اور جھنجلاہٹ سے اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور جب اس نے بادشاہ کو سارا قصہ سنایا تو اس وقت بھی اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ بادشاہ نے اسے بڑی تسلی دی کہ وہ اس جیسے کئی ہار اسے بنوا دے گا مگر ملکہ کی ضد تھی کہ اسے گم ہونے والا ہار ہی تلاش کر کے دیا جائے۔

بادشاہ نے تمام نقارچیوں کو بلایا اور انہیں ملک کے قریہ قریہ میں پھیل کر منادی کرنے کو کہا کہ اگر وہ ہار کوئی ڈھونڈ کر لائے گا تو اسے منہ مانگا انعام دیا جائے گا۔ اسی اثنا میں کوا ہار لے کر بادشاہ کے محل سے اُڑا اور شہر کے سب سے اندھیرے اور گندے محلے میں جا پہنچا۔ یہ جھونپڑی ایک بوڑھی دھوبن کی تھی جو جھونپڑی میں اپنی ایک ساتھی کے ساتھ رہتی تھی جس کا نام غربت دیوی تھا۔ اگرچہ وہ دونوں ایک دوسرے کو اتنا پسند نہیں کرتی تھیں لیکن ان کا ساتھ بہت پرانا تھا اور اب تو دھوبن کو بھی غربت کی عادت ہو گئی تھی۔

جس لمحے کوے نے ہار کو گرایا، دونوں عورتیں اس وقت اپنی جھونپڑی میں موجود نہیں تھیں۔ دھوبن دھونے کے لیے لوگوں سے گندے کپڑے اکٹھے کر رہی تھی اور غربت دیوی ہمیشہ کی طرح اس کے ساتھ تھی۔ گھر واپس جاتے ہوئے وہ بازار سے گزریں تو انہوں نے منادی کرنے والے سے ہار کے گم ہونے اور ڈھونڈنے والے کو انعام ملنے کے متعلق سنا۔ غربت دیوی حسبِ عادت منہ ہی منہ میں منمنائی۔ ”دیکھو! یہ ہیں دولت والوں کے نخرے۔ پتا نہیں کیسے لاپرواہی سے چیزیں گم کر دیتے ہیں اور پھر ہم غریبوں کو تنگ کرتے ہیں۔“

لیکن دھوبن کچھ اور ہی سوچ رہی تھی۔ دھوبن نے کبھی کوئی قیمتی زیور نہیں دیکھا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ کاش کھویا ہوا ہار اسے مل جائے تو اس کی قسمت کھل جائے۔ پھر جیسے ہی وہ دونوں اپنی جھونپڑی میں پہنچیں اور دھوبن نے دھونے والے کپڑے زمین پر رکھے تو فرش پر اسے جگمگاتا ہوا ہار پڑا ملا۔ اس نے فوراً ہار کو اٹھایا اور اسے پہننے ہی لگی تھی کہ اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال آیا کہ مجھے کسی کو کچھ بتانا ہے۔ اس نے غربت دیوی کو کہا اور بادشاہ کے محل کی طرف روانہ ہو گئی۔ ممکن تھا کہ بادشاہ کے محافظ اسے محل کے اندر جانے نہ دیتے مگر جب انہیں اصل بات کا علم ہوا تو وہ خود اسے بادشاہ کے حضور لے گئے۔ بادشاہ ملکہ کا ہار دیکھ کر بہت خوش ہوا اور وہ چاہتا تھا کہ دھوبن کو منہ مانگا انعام دے مگر دھوبن کے انکار پر وہ شدید حیرت کا شکار ہو گیا۔ دھوبن کے ذہن میں کچھ اور ہی چل رہا تھا۔ اس نے بادشاہ کو درخواست کی کہ وہ غریب دھوبن ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ رقم دینے کے بجائے اس کی ایک خواہش

پوری کر دی جائے اور وہ خواہش یہ ہے کہ آج دیوالی ہے۔ اس موقع پر بادشاہ سلامت کی ریاست میں کوئی دیا یا چراغ نہ جلائے، حتیٰ کہ بادشاہ سلامت بھی۔ میں چاہتی ہوں کہ میرے گھر کے دیے کے علاوہ پوری ریاست میں مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک گھپ اندھیرا ہو۔ بادشاہ سلامت نے فوراً اس کی بات مانتے ہوئے ریاست میں جگہ جگہ منادی کرا دی کہ آج دیوالی کی رات کوئی اپنے گھر میں روشنی نہیں کرے گا۔ اس نے اپنے محل کے ملازموں کو بھی سختی سے اس حکم کی پابندی کرنے کو کہہ دیا۔ دھوبن یہ سب انتظامات مکمل کر کے اپنی جھونپڑی کی طرف بھاگی۔ راستے میں اس نے اپنی مالی حیثیت کے مطابق زیادہ سے زیادہ تیل کے دیے خرید لیے اور رات ہونے کا انتظار کرنے لگی۔

رات ہوتے ہی دھوبن نے تمام دیے روشن کر دیئے۔ پھر اس نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی تو تمام سمتوں میں اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ اتنی دیر میں لکشمی دیوی آسمان سے زمین پر اتر آئی تھی اور چاہتی تھی کہ ہر سال کی طرح گھروں میں خوش حالی لے کر جائے اور گھروں کے مکین اس کا استقبال جلتے ہوئے چراغوں سے کریں اور ہر طرف روشنی ہی روشنی ہو لیکن لکشمی دیوی کا اس سال حیرت سے بُرا حال تھا۔ کہیں دُور دُور تک روشنی کا نام ونشان نہ تھا۔ وہ بے چاری اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتی ایک دوسرے گھر میں گئی مگر روشنی کی ایک کرن تک اسے دکھائی نہیں دی۔ اچانک اس نے ٹمٹماتی ہوئی روشنیاں دیکھیں۔ یہ وہ چراغ تھے جو دھوبن کی جھونپڑی پر روشنی بکھیر رہے تھے۔ لکشمی دیوی نے بے اختیار روشنیوں کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔

اب آدھی رات بیت چکی تھی۔ جب تھکی ہاری لکشمی دیوی دھوبن کی جھونپڑی کے باہر پہنچی تو اس نے زور زور سے دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا۔ اس نے دھوبن کی منت کی کہ وہ بہت تھک چکی ہے، لہٰذا وہ اسے اندر آنے دے۔ دھوبن کو تو اسی لمحے کا انتظار تھا۔ اس نے لکشمی دیوی کو کہا کہ وہ اسے صرف اسی صورت میں جھونپڑی کے اندر آنے دے گی، اگر وہ وعدہ کرے کہ وہ یہاں سات پشتوں تک رہے گی۔

عین اسی وقت دھوبن نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو غربت پچھلے دروازے سے جھونپڑی سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دھوبن بھاگی اور اس نے جھونپڑی کا پچھلا دروازہ تالے سے بند کر دیا اور تالے کی چابی اپنی مٹھی میں کر لی۔

تبھی غربت نے شور مچانا شروع کر دیا کہ مجھے جانے دو، مجھے جانے دو۔ تمہیں پتا ہے کہ میں اور لکشمی دیوی ایک چھت کے نیچے نہیں رہ سکتے۔ میں غربت ہوں اور وہ خوش حالی ہے۔ تب دھوبن بولی کہ ٹھیک ہے میں تمہیں اس صورت میں جھونپڑی سے باہر نکالوں گی، اگر تم وعدہ کرو گے تم سات پشتوں تک میرے پاس نہیں آؤ گی۔ غربت نے فوراً وعدہ کر لیا کہ اگر دھوبن اسے جھونپڑی کے پچھلے دروازے سے جانے دے گی تو وہ سات پشتوں تک واپس نہیں آئے گی کیوں کہ وہ لکشمی دیوی کا سامنا نہیں کر سکتی۔ تب دھوبن نے جھونپڑی کا پچھلا دروازہ کھول دیا اور غربت وہاں سے نو دو گیارہ ہوگئی۔ پھر جلدی سے دھوبن جھونپڑی کے بیرونی دروازے کی طرف بھاگی جہاں لکشمی دیوی کا دم یہ کہہ کر پھولا جا رہا تھا کہ اسے جھونپڑی کے اندر آنے دیا جائے۔

دھوبن نے دروازہ کھولنے سے قبل اپنی شرط دوبارہ لکشمی دیوی کو یاد دلائی کہ وہ سات پشتوں تک اس کے پاس ہی رہے گی۔ لکشمی دیوی کے ہاں کرتے ہی دھوبن نے دروازہ کھول دیا اور پھر کیا تھا لکشمی دیوی دھوبن کی جھونپڑی میں داخل ہوتے ہی دھوبن کے دن پھر گئے اور خوش حالی کا یہ دور دھوبن کی سات پشتوں تک رہا۔ ☆☆

تندرستی کا راز

کسی بادشاہ نے رسولؐ خدا کی خدمت میں ایک طبیب بھیجا کہ ضرورت کے وقت آپؐ کی جماعت کا علاج معالجہ کیا کرے۔ طبیب مدتوں مدینے میں حاضر رہا مگر کسی شخص نے اس سے علاج کے لیے رجوع نہ کیا۔ حکیم نے یہ مسلسل بے کاری دیکھ کر آخر ایک دن آپؐ کی خدمت میں عرض کی کہ حضورؐ جانتے ہیں کہ خاک سار اتنی مدت سے صرف آپؐ کے جان نثاروں کی خدمت کے لیے حاضر ہے مگر عرصے سے میری طرف کسی نے بھی رجوع نہیں کیا۔

حضورؐ نے فرمایا: ''ان لوگوں کا قاعدہ ہے کہ جب تک بھوک غالب نہ ہو، کھانے کو ہاتھ نہیں لگاتے اور ابھی پیٹ نہیں بھرتا کہ ہاتھ اٹھا لیتے ہیں۔ اس لیے آپ کی خدمت سے فائدہ اٹھانے کا موقع کم ملتا ہے۔'' حکیم نے کہا: ''بے شک تندرستی کا یہی اصل راز ہے جس کے ہوتے ہوئے میری حاضری بے کار ہے۔'' اس کے بعد حکیم نے آداب بجالا کر وطن کی راہ لی۔

ہیرو

عبدالرشید فاروقی

سمیر کو کتابیں سمیٹتے دیکھ کر پاکیزہ نے منہ بنایا اور بولی:

''یہ کیا، آپ تو کتابیں بیگ میں ڈال رہے ہیں!''

''اور کیا کروں؟'' سمیر نے اس سے بھی زیادہ بُرا سا منہ بنایا۔

''آپ نے ہوم ورک تو مکمل کیا نہیں...... اور...''

''بعد میں مکمل کرلوں گا، کھیلنے کا وقت ہوگیا ہے، اس لیے میں جارہا ہوں۔'' سمیر نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

''لیکن بھائی! کام کو اُدھورا نہیں چھوڑنا چاہیے، اگر آپ ہوم ورک مکمل کرلیں تو بہتر ہوگا۔''

''اپنی نصیحتیں، اپنے پاس رکھو، میں تو چلا۔'' سمیر نے تیز لہجے میں کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

پاکیزہ نے اپنا ہوم ورک مکمل کیا ہی تھا کہ امی اس کے پاس چلی آئیں۔ وہ سمیر کو کمرے میں نہ پا کر حیران رہ گئیں۔

''پاکیزہ! یہ سمیر کہاں چلا گیا؟''

''بھائی اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلنے گیا ہے۔''

''کیا اس نے ہوم ورک مکمل کرلیا تھا؟''

''جی نہیں......'' پاکیزہ نے آہستہ سے کہا اور کمرے سے نکل گئی۔

......☆......

اُسے سر جھکائے دیکھ کر انہوں نے اُس کے گال پر چٹکی لی اور بولیں: ''کیا بات ہے، یوں کیوں بیٹھے ہو؟''

سمیر نے سر اٹھا کر ایک نظر امی کو دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔ یہ دیکھ کر وہ تڑپ اُٹھیں:

''بیٹے! کیا بات ہے، اسکول میں کوئی بات ہوئی ہے یا کسی دوست نے آج پھر کچھ کہا ہے؟''

وہ انہیں دیکھنے لگا اور پھر اس کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو نکل کر گالوں پر پھیل گئے۔ امی بے چین ہوگئیں۔

''کیا ہوا میرے چاند کو......؟''

''وہ...... وہ امی جان......'' سمیر بات پوری نہ کرسکا۔

''وہ کیا بیٹے...... کیا ہوا...... یہ تمہاری آنکھوں میں آنسو

کیسے؟"

"امی جان! میں...... میں ایسا کیوں ہوں؟" سمیر بمشکل جملہ مکمل کیا۔

"کیسا...... کیسے ہو تم؟"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی آنکھیں اب مسلسل موتی گرا رہی تھیں۔ اس کے آنسو امی کی بے چینی میں اضافے کا سبب بن رہے تھے۔ وہ ٹکر ٹکر اسے دیکھنے لگیں۔

"امی جان! وہ میرا دوست خالد ریاض ہے نا۔"

"کیا ہوا اُسے؟"

"اسے تو کچھ نہیں ہوا، امی......"

"تو پھر......؟" انہوں نے جلدی سے پوچھا۔

"مجھ سے کچھ نہیں ہوتا ہے......" سمیر نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب...... کیا نہیں ہوتا تم سے؟"

"امی! میں کسی کام کا نہیں ہوں...... بالکل نکما ہوں۔"

"نکمے ہو...... پہیلیاں کیوں بجھوا رہے ہو، صاف صاف کہو، کیا بات ہے؟"

"خالد ریاض نے آج پھر مجھے ہرا دیا ہے...... وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی مجھ سے جیت گیا ہے۔" اس کے لہجے میں دُکھ امی نے صاف محسوس کیا۔ بیٹے کی بات سن کر وہ چند لمحے خاموش رہیں، پھر کہنے لگیں:

"اگر تم ہمت، حوصلے سے کام لو تو اس سے جیت سکتے ہو۔ بیٹے! دُنیا میں وہی لوگ کام یاب ہوتے ہیں جو زندگی کے ہر موڑ پر ہمت، جرأت، بہادری اور حوصلے سے کام لیتے ہیں۔ ہمت ہارنے والے افراد کبھی کام یابی کا منہ نہیں دیکھ سکتے......"

"میں بہت کوشش کرتا ہوں، اس سے جیت جاؤں لیکن وہ ہر جگہ اور ہمیشہ مجھ سے بازی لے جاتا ہے۔" سمیر نے کہا۔ اس کے لہجے سے مایوسی صاف عیاں تھی۔

"بیٹے! خالد ریاض تم سے عمر میں بڑا ہرگز نہیں ہے، پھر وہ ہمیشہ تم سے جیت کیوں جاتا ہے۔ حالانکہ تم اچھی بلے بازی کر لیتے ہو۔" وہ مسکرائیں۔

"بالکل...... میرے دوسرے دوست بھی یہی بات کہتے ہیں، میری بلے بازی خالد ریاض سے اچھی ہے، لیکن......" سمیر نے بُرا سا منہ بنایا۔ جواب میں امی نے کچھ نہ کہا اور خاموشی سے باورچی خانے کی طرف بڑھ گئیں جب کہ قریب ہی بیٹھے سمیر کے ابا جان، ماں بیٹے کی گفتگو سن کر مسکرانے لگے۔

......☆......

زوبیہ کے رونے کی آواز سن کر وہ دوڑ کر کمرے میں پہنچیں تو دیکھا، سمیر اس کے بسکٹ اُٹھا کر کھا رہا تھا۔ ننھی زوبیہ سے یہ زیادتی برداشت نہ ہو سکی، اس لیے وہ رونے لگی تھی۔ امی کو دیکھ کر سمیر جلدی سے اُٹھا اور چارپائی پر جا کر بیٹھ گیا۔ انہوں نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔

"بڑے بھائی تو چھوٹی بہنوں کا خیال رکھتے ہیں...... ایک تم ہو کہ......"

"امی جان! بھوک لگ رہی تھی، اس لیے زوبیہ کے بسکٹ کھانے لگا تھا۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"بھوک لگ رہی تھی تو مجھ سے کہتے...... تمہیں کھانے کے لیے کچھ نہ کچھ تو میں دے ہی دیتی۔ ارے! تم کب سدھرو گے؟" امی نے غصے سے کہا اور زوبیہ کو اُٹھا کر کمرے سے نکل گئیں جب کہ وہ بُرا سا منہ بنانے لگا۔

......☆......

"25 دسمبر کو تمہاری سال گرہ ہے، کیا تم اس بار مجھے بلاؤ گے؟" خالد ریاض نے سمیر کے کندھے پر زور سے ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"ہاں، کیوں نہیں...... میں تمہیں ضرور بلاؤں گا، اس کے باوجود کہ تم مجھے بلے بازی میں ہمیشہ ہرا دیتے ہو۔ کپتان کی نظروں میں تم ہیرو ہو اور میں زیرو...... کیوں کپتان صاحب؟" سمیر نے مسکراتے ہوئے امجد کی طرف دیکھا۔ وہ ان کے ٹیم کا کپتان تھا۔

"اس میں شک نہیں، خالد ریاض آج کل تم سے اچھی بلے بازی کر رہا تھا۔ تم تو ان دنوں شاہد خان آفریدی بنے ہوئے ہو۔ جس طرح وہ بار بار بلے بازی میں فیل ہو رہا ہے، اسی طرح تم بھی ناکام جا رہے ہو...... یہ یقیناً ہیرو ہے۔" امجد نے کہا۔

"اور ہیرو لوگ باہمت اور باحوصلہ ہوتے ہیں...... اور تم رہے کم ہمت...... ہمت تو تم میں نام کو بھی نہیں ہے...... کیوں دوستو؟" خالد ریاض نے کہا تو سبھی ہنسنے لگے جب کہ سمیر بُرا منہ بنانے لگا۔

......☆......

سبھی ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے کہ ایسے میں سمیر نے اعلان کرنے والے انداز میں کہا:

''ابا جان! میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔''

''شکر ہے..... تم نے بھی کوئی فیصلہ کیا، ورنہ.....'' امی نے مسکرا کر کہا تو ابا جان نے گھور کر ان کی طرف دیکھا۔

''بیگم! آپ ذرا خاموش رہیں، مجھے بات کرنے دیں۔ ہاں تو بیٹا! تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟'' وہ سمیر کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولے۔

''میں نے فیصلہ کیا ہے، اس بار اپنی سال گرہ کے ساتھ ساتھ میں قائداعظم محمد علی جناح کی سال گرہ بھی مناؤں گا۔''

''کیا مطلب؟'' انہوں نے کہا۔

''مطلب یہ کہ اس سال 25 دسمبر کو میں اپنی سال گرہ کے ساتھ ساتھ قائداعظم کی سال گرہ بھی مناؤں گا۔'' سمیر مسکرایا۔

''اور آپ ہمارا ساتھ دیں۔'' پاکیزہ نے جلدی سے کہا۔

''گویا 25 دسمبر کو ہم سب مل کر سمیر اور قائداعظم محمد علی جناح کی سال گرہ منائیں گے۔''

''بالکل۔'' سمیر نے خوش ہو کر کہا۔

''لیکن اس بار میرا ارادہ ذرا مختلف ہے۔'' ابا جان کے چہرے پر نمودار ہونے والی مسکراہٹ کو دیکھ کر سمیر اور پاکیزہ حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر پاکیزہ کی آواز ابھری:

''اور آپ کا وہ مختلف ارادہ کیا ہے ابا جان؟''

''یہ کہ اس بار ہم صرف قائداعظم محمد علی جناح کی سال گرہ منائیں گے۔''

''کیا مطلب!!!'' سمیر زور سے اُچھلا۔

''کس بات کا مطلب بتاؤں؟ میں نے کوئی مشکل بات نہیں کہی۔'' وہ مسکرائے۔

''ابا جان! آپ بھائی کی سال گرہ کیوں نہیں منائیں گے بھلا؟'' پاکیزہ نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ننھی زوبیہ منہ کھولے سب کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''بات یہ ہے، مجھے بہادر، باہمت، حوصلہ مند، بات کے پکے اور کام کے دھنی لوگوں سے پیار ہے۔ میں ان لوگوں کو بہت پسند کرتا ہوں جو ہر مشکل کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہیں اور اکیلے ہی بہت کچھ کرنے کا حوصلہ اور یقین رکھتے ہیں۔ قائداعظم محمد علی جناح میں چونکہ یہ ساری خوبیاں تھیں، اس لیے میں تمہارے فیصلے کا احترام کرتا ہوں..... اس سال قائداعظم کی سال گرہ منائی جائے گی۔''

''آپ..... آپ کا مطلب ہے، آپ صرف قائد کی سال گرہ منائیں گے..... میری نہیں۔''
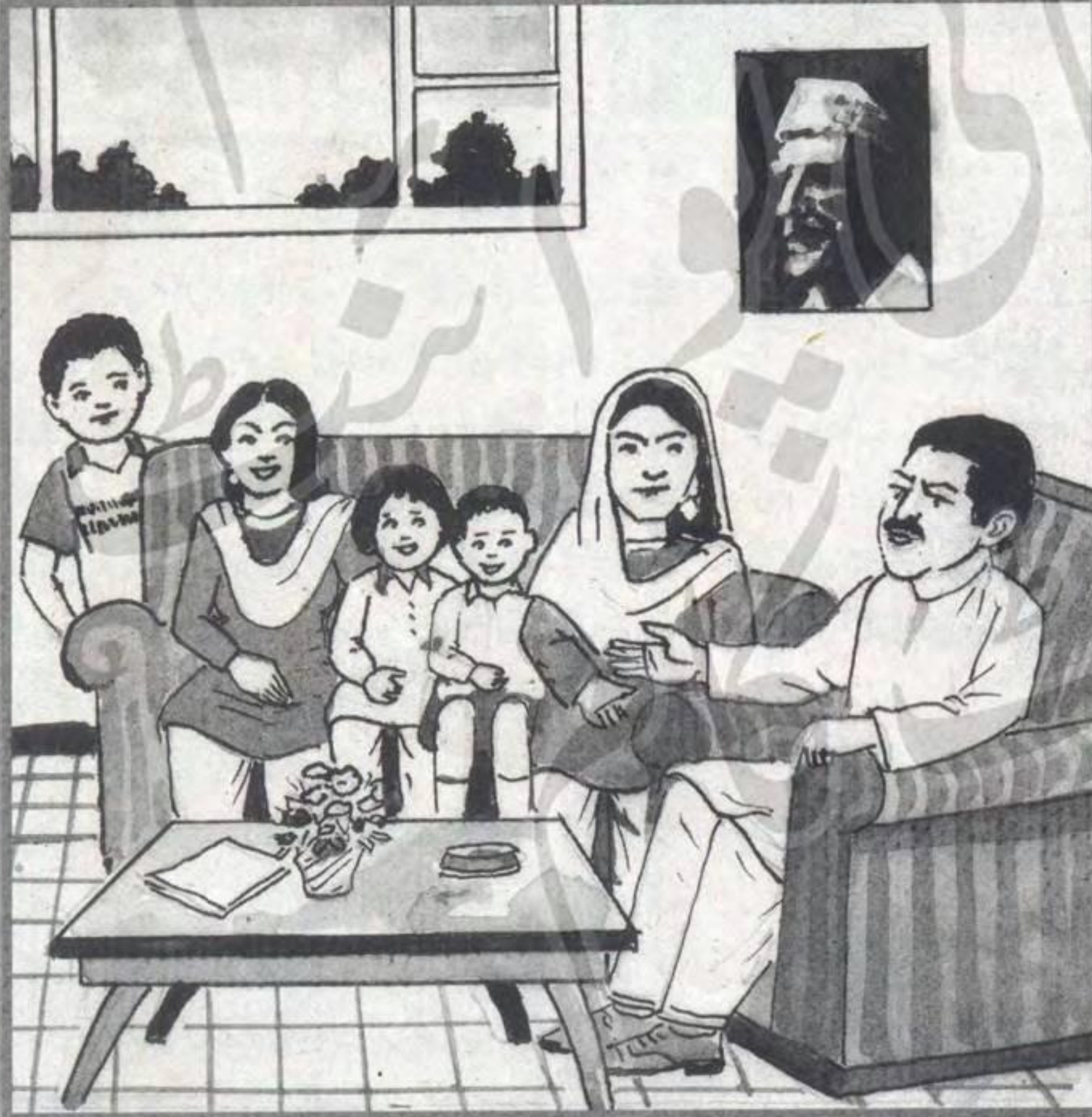
”آپ کو قائد سے محبت ہے؟“ ابا جان نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے سوال کیا۔

”جی ہاں! وہ میرے ہیرو ہیں بلکہ سارے پاکستانیوں کے ہیرو ہیں، اسی لیے تو میں اور پاکیزہ ان کی سال گرہ منانا چاہتے ہیں۔“

”بچو! اگر تم واقعی قائداعظم محمد علی جناح سے پیار کرتے ہو اور وہ تمھارے ہیرو ہیں تو ان کی سال گرہ ضرور مناؤ۔“

”لیکن آپ نے ابھی ابھی کہا ہے، آپ صرف قائد کی سال گرہ منانا چاہتے ہیں...... میری سال گرہ نہیں منائیں گے...... آخر کیوں؟“ سمیر نے کیوں پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”اس لیے کہ میں کم ہمت لوگوں سے پیار نہیں کرتا...... ڈرنے اور گھبرانے والے لوگ مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتے ہیں، آپ کی امی نے مجھے آپ کی باتوں اور حرکتوں کے بارے آگاہ کر دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں، آپ میں ہمت، حوصلہ، اللہ تعالیٰ اور خود پر یقین نہیں ہے۔ لہٰذا میں نے فیصلہ کیا ہے، اس سال تمھاری سال گرہ نہیں منائی جائے گی...... صرف قائد کی سال گرہ منائی جائے گی۔“

سمیر اور پاکیزہ نے امی کی طرف دیکھا لیکن ان کے چہرے پر سنجیدگی کے آثار دیکھ کر ان کی آخری اُمید بھی گویا دم توڑ گئی۔ ان کے چہرے اُتر گئے۔

امی جان بولیں: ”بیٹا! تمام انسان اللہ تعالیٰ نے ایک جیسے پیدا کیے ہیں۔ یہ ان کی محنت، حوصلہ اور یقین کی دولت ہی ہے جو انھیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔ انھیں ہیرو بناتی ہے۔ تم اپنے دوستوں سے کم نہیں ہو۔ اگر وہ تمھیں کسی بات یا کام میں پیچھے چھوڑ دیتے ہیں تو غور کرو، ایسا کیوں ہے؟ تم اپنے ہیرو قائداعظم محمد علی جناح سے پیار کرتے ہو۔ انھوں نے تو کام، کام اور بس کام کرنے کی تلقین کی تھی اور تم ہو کہ اسکول کا ہوم ورک بھی اُدھورا چھوڑ دیتے ہو، آج کا کام کل پر ڈال دیتے ہو۔ کم ہمتی کی باتیں میں نے تمھارے منہ سے کئی بار سنی ہیں۔ چھوٹوں کو تنگ کرنا اور انھیں تکلیف میں دیکھ کر مسکرانا تمھیں اچھا لگتا ہے۔“ امی کہتی چلی گئیں۔ پاکیزہ خاموشی سے امی، ابو کی باتیں سن رہی تھی جب کہ سمیر کی حالت یہ تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ اس کی حالت کو محسوس کرتے ہوئے ابا جان کہنے لگے:

”اگر تم چاہتے ہو، 25 دسمبر کو قائد کی سال گرہ کے ساتھ ساتھ، اپنی سال گرہ بھی مناؤ تو تمھیں ہم سے ایک وعدہ کرنا ہوگا۔“

”کیسا وعدہ؟“ سمیر نے آہستہ سے پوچھا۔

”یہ کہ تم اپنی ذات میں وہ تمام اچھی باتیں اور خوبیاں پیدا کرو جن کی وجہ سے محمد علی جناح، قائداعظم اور ہیرو کہلائے۔ بیٹے! کسی بڑے آدمی سے محبت کی جائے تو ضروری ہے کہ اس کی شخصیت میں موجود خوبیاں اور اچھائیاں اپنی ذات میں پیدا کی جائیں۔ محبت کا تقاضا یہی ہے کہ ہم جن سے محبت کرتے ہیں، ان جیسا بننے کی کوشش بھی کریں ورنہ محبت کا دعویٰ سچ نہیں ہوگا۔ محض جھوٹ ہی ہوگا اور آپ جانتے ہیں، جھوٹ پر ٹکی زندگی مزا نہیں دیتی۔ زندگی میں مزا چاہتے ہو تو عمل کرو۔ ہر اچھی بات پر، اچھے قول پر۔ قائداعظم محمد علی جناح نے قوم کے نام بہت سے پیغامات اور نصیحتیں چھوڑی ہیں۔ اگر تم واقعی ان سے پیار کرتے ہو تو ان جیسا بننے کی کوشش کرو۔ یہی وعدہ میں تم سے لینا چاہتا ہوں۔ بولو، کرتے ہو مجھ سے وعدہ، تم ہیرو بنو گے۔ محمد علی جناح جیسے بنو گے۔ بیٹے! مایوسی کا دوسرا نام موت ہے۔ زندگی کو زندگی کی طرح جینا چاہتے ہو تو اس مایوسی کو کبھی خود پر حاوی نہ ہونے دینا۔“ ابا جان چپ ہو کر سمیر کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ کئی لمحے خاموش رہا، پھر کہنے لگا۔ سب نے اس کے لہجے میں عزم محسوس کیا:

”ابا جان! بہت شکریہ، آپ نے میری آنکھیں کھول دیں۔ میں آج آپ سے وعدہ کرتا ہوں، قائداعظم کی خوبیوں کو اپنانے کی کوشش کروں گا۔ میرے لیے دعا کیجیے گا۔“

”زندگی میں تم جب بھی کچھ اچھا کام کرنے کی کوشش کروگے، میری اور تمھاری امی کی دعائیں، چپکے سے ہمیشہ تمھارے ساتھ ہو جائیں گی۔“

”بس تو پھر ٹھیک ہے۔ میں قائد بنوں، نہ بنوں...... ہیرو ضرور بنوں گا۔ ایک اچھا ہیرو جسے سب پیار کریں گے...... ان شاءاللہ۔“

”ان شاءاللہ۔“ ابا جان کے منہ سے نکلا۔

امی اور پاکیزہ کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی جب کہ ننھی زوبیہ سر اُٹھا کر بھائی کو دیکھنے لگی۔

☆☆☆

وقت یکساں نہیں رہتا

بینا رانی

دروازے پر ہلکی سی چرچراہٹ ہوئی۔ نذر حسین نے ڈرتے ڈرتے کمرے میں قدم رکھا۔ انتہائی آہستگی سے چلتا ہوا سیٹھ صاحب کے قریب پہنچا اور مودبانہ انداز میں گویا ہوا۔

''صاحب جی کام پورا ہو گیا ہے...... میں جاؤں؟'' فرہاد نیازی نے نظر اٹھا کر ملازم کی طرف دیکھا۔

''ہوں۔'' نذر حسین کھڑا رہا۔ شاید کچھ کہنا چاہتا تھا۔ سیٹھ صاحب کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ انہوں نے اس کی طرف دیکھ کر بھنوئیں اچکائیں۔

''وہ...... وہ صاحب جی تنخواہ......'' ملازم نے ڈرتے ڈرتے کہہ ہی دیا۔ سیٹھ صاحب نے غصہ سے ایک نظر اس کے سراپے پر ڈالی اور سر کے اشارے سے اسے باہر چلے جانے کا اشارہ کر دیا۔ نذر حسین چاروناچار آنکھوں میں آنسو لیے باہر آ گیا۔ فرہاد نیازی کروڑوں میں کھیلنے والے ایک مغرور اور سخت مزاج انسان تھا۔ غریبوں کی ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ انہیں بہت حقیر خیال کیا کرتے تھے۔ غریبوں اور مجبور لوگوں کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا ان کا دل پسند مشغلہ تھا۔ کسی ضرورت مند کو قرض دے کر اس سے اس کی مجبوری کے وقت قرض لوٹانے کا مطالبہ کرتے، انہیں ذلیل کرنا انہیں بہت پسند تھا۔ ملازمین کو تنخواہ رُلا رُلا کر دیتے اور اگر کوئی ملازم اپنی مجبوری بتا دیتا پھر تو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہتا۔ جب تک اسے مجبور ہو کر روتا نہ دیکھ لیتے انہیں چین نہ آتا۔ ملازمین بھی شاید غربت اور مہنگائی کے آگے مجبور ہو کر یہاں ملازمت کر رہے تھے۔ سیٹھ کا ایک ہی بیٹا تھا جو انہیں جان سے زیادہ عزیز تھا۔ اس کی ہر خواہش لب پر آتے ہی پوری کر دینا اس کی چاہت تھی۔ سیٹھ کا کپڑے کا بہت وسیع کاروبار تھا۔ اس نے نہ جانے کتنی ہی جائیدادیں خرید خرید کر ریحان کے نام کی ہوئی تھی۔

''صاحب جی...... خدا کے لیے آج تو تنخواہ دے دیجیے۔ میری بیٹی بیمار ہے صاحب...... اسے اسپتال لے کر جانا ہے۔ میرے پاس تو کرائے تک کے پیسے نہیں ہیں۔ میری بیٹی کی طبیعت

بہت خراب ہے صاحب جی...... میں آپ کو بہت دُعائیں دوں گا۔'' آج تین تاریخ تھی۔ سیٹھ نے پانچ چھ تاریخ سے پہلے تو ہرگز تنخواہ نہیں دیتا تھا۔

''اچھا ٹھیک ہے ابھی جاؤ کچھ دن بعد بات کرنا۔'' سیٹھ نے بے نیازی سے کہا اور رُخ موڑ کر بیٹھ گیا۔

''صاحب میں کام کر کے پیسے مانگ رہا ہوں، بھیک تو نہیں مانگ رہا آپ سے......'' جانے کس ہمت سے نذر حسین نے کہہ دیا تھا۔ شاید بچی کی حالت اور بیوی کے آنسوؤں نے اس میں جرأت پیدا کر دی تھی۔ ادھر فرہاد نیازی کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ انہوں نے بیل پر ہاتھ رکھ دیا۔ دو ملازم دوڑتے ہوئے ان کے کمرے میں داخل ہوئے۔ سیٹھ نے نذر حسین کی طرف دیکھ کر انگلی سے باہر کی طرف اشارہ کیا۔ دونوں ملازم بادل نخواستہ نذر حسین کو کھینچتے ہوئے باہر کی طرف لے گئے۔ سیٹھ نے گردن کو جھٹکا دیا اور اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی۔

''بابا جان میں اپنے دوستوں کے ساتھ گھومنے جا رہا ہوں۔ کچھ پیسوں کی ضرورت ہے۔'' ان کا اکلوتا بیٹا ریحان ان کے کمرے میں داخل ہوتے ہی بولا۔ سیٹھ اسے دیکھ کر پیار سے مسکرایا اور تجوری کی چابی اس کی طرف اُچھال دی۔ ریحان نے تیزی سے تجوری کھولی پانچ پانچ ہزار کے کچھ نوٹ اُٹھا کر جیب میں ڈالے اور تجوری لاک کر دی۔

''بابا جان میں نئی لینڈ کروزر میں جانا ہے۔'' بیٹے نے پھر فرمائش کی۔ سیٹھ صاحب نے نئی گاڑی کی چابی خوشدلی سے اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ ریحان چابی لے کر باہر نکل گیا۔

''صاحب جی! آج نذر حسین نہیں آیا ناں...... وہ...... وہ صاحب۔ اس کی بیٹی فوت ہو گئی ہے۔'' سیٹھ صاحب کے دوسرے ملازم نے آ کر اطلاع کی۔ سیٹھ صاحب خاموش رہے۔ ان کے چہرے پر کسی قسم کے کوئی تاثرات نہ ابھرے، البتہ انہوں نے نذر حسین کی تنخواہ اس ملازم کے ہاتھ میں دے کر حکم دیا کہ نذر حسین کے گھر دے آئے۔ کچھ ہی دیر بعد ملازم رقم واپس لے آیا۔

''صاحب نذر حسین نے تنخواہ لینے سے انکار کر دیا ہے۔'' سیٹھ صاحب نے مسکراتے ہوئے پیسے لے کر رکھ لیے۔

''صاحب جی...... وہ...... وہ...... صاحب جی۔'' ایک ملازم دوڑتا ہوا ان کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں خوف و ہراس چھایا ہوا تھا اور جسم تھر تھر کانپ رہا تھا۔ وہ کوشش کے باوجود اپنی بات پوری نہ کر سکا۔ فرہاد نیازی کے نزدیک اس قسم کی حرکتیں کرنا اداکاری کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وہ کھا جانے والے انداز میں ملازم کو گھورنے لگا۔ اس کے چہرے کے زاویے غصہ کی زیادتی سے بدلنے لگے تھے، نتھنے پھول گئے تھے۔

''صاحب جی وہ...... وہ...''

''وہ سے آگے بھی کچھ بولنا ہے تو بولو...... ورنہ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔'' سیٹھ صاحب کا غصہ آسمان سے باتیں کر رہا تھا۔

''صاحب جی وہ چھوٹے صاحب سیر و تفریح کے لیے گئے تھے ناں...... تو...... تو صاحب...... وہ دریا میں ڈوب کر فف...... فوت ہو گئے ہیں، ان کے دوستوں کا کہنا ہے کہ اس کی لاش بڑی مشکل سے ملی ہے۔ وہ لاش لے کر آنے ہی والے ہیں صاحب!''

''کیا!!!'' سیٹھ صاحب اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر صوفے پر گرتے چلے گئے۔ ان کا جسم لرز رہا تھا۔ انہیں لگا جیسے شدت غم سے ان کا دماغ پھٹ جائے گا۔ کچھ ہی دیر کے بعد ریحان کی لاش گھر پہنچ گئی۔ ان کا اکلوتا لخت جگر ان کی امیدوں کا واحد محور و مرکز، ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک بے جان وجود کے ساتھ ان کے سامنے پڑا تھا۔ آخر اس کی تجہیز و تکفین کر دی گئی۔ سیٹھ صاحب کو دُنیا اندھیر لگنے لگی تھی۔ نذر حسین کی آہ نے اس کے بیٹے کو کھا لیا تھا۔

تین دن کے بعد انہیں ایک رقعہ ملا نذر حسین کی طرف سے...... انہوں نے دیکھا ایک کاغذ پر لکھا تھا۔

وقت یکساں نہیں رہتا یہ بھی ظالم سن لیں
خود بھی رو پڑتے ہیں اوروں کو رُلانے والے

ان الفاظ نے جلتی پر تیل کا کام کیا تھا مگر سیٹھ صاحب کچھ نہیں کر سکتے تھے کیوں کہ نذر حسین تو کب کا ملازمت چھوڑ کر جا چکا تھا۔

☆......☆......☆

راشد علی نواب شاہی

اَلرَّافِعُ جَلَّ جَلَالُہٗ (بلند کرنے والا)

اَلرَّافِعُ جَلَّ جَلَالُہٗ وہ فرماں برداری پر ثابت رہنے والوں کی رہنمائی فرما کر انہیں بلند کرتا ہے۔

کسی کو بڑا رتبہ اور مقام دیا اور کسی کو کم مرتبہ دیا۔ کسی کو زیادہ فضیلت عطا فرمائی اور کسی کو کم جیسے ہمارے پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے افضل نبی بنایا۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو دوسرے تمام بزرگوں اور مسلمانوں پر فضیلت بخشی۔ کسی کو لڑکا بنایا اور کسی کو لڑکی، کسی کو بہت ہی حسین بنایا اور کسی کو حسن سے محروم رکھا۔ کسی کو لمبا قد عطا فرمایا اور کسی کو چھوٹا۔ وہی خوب جانتا ہے کہ کس کو کیسے بنانا ہے۔ بس ہمیں اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر راضی رہنا چاہیے۔

منفرد لڑائی

پاؤں کو یہ حسد تھا کہ جسم میں سر کیوں بلند ہے؟ وہ سارے جسم پر حکومت کر رہا ہے اور ہم پست کیوں؟ جس کی وجہ سے وہ سر کا حکم ماننے پر مجبور تھے۔ ''تمہارا سارا بوجھ ہم برداشت کرتے ہیں۔ چلنا ہمیں پڑتا ہے، ٹھوکر ہمیں لگتی ہے اور تم جہاں جاؤ تو تمہاری عزت ہی عزت ہوتی ہے لیٹو، تو تمہیں فوراً تکیہ پیش کیا جاتا ہے۔'' پیروں نے سر سے شکایت کی۔

''تو اس میں کیا حرج ہے......؟ وہ اللہ جسے چاہے بلند کرے اور جسے چاہے پست کرے...... اور ویسے تم بھی تو لمحے میں ایسی لاتیں رسید کر دیتے ہو کہ آدمی کا سر گھوم جاتا ہے۔'' سر نے کہا۔

''وہ تو میں دوسرے کا سر گھماتا ہوں تمہارا تو نہیں گھما سکتا نا...... اصل تو تمہیں گھمانا ہے......!!'' دائیں پیر نے بڑھ کر کہا۔

''تمہیں آخر مجھ سے کیا دشمنی ہے......؟ کیوں دشمنی پر تلے بیٹھے ہو......؟ خدارا، میرا راستہ چھوڑ دو، مجھے معاف کر دو۔'' سر نے منت سماجت کرتے ہوئے کہا۔

''ہمیں دشمنی یہی ہے کہ تم خوامخواہ چلاتے رہتے ہو، تمہاری حکومت ہم سے برداشت نہیں ہوتی۔'' اس مرتبہ بائیں پیر نے بڑھ چڑھ کر اس سے دشمنی کا اعلان کیا۔

''اے جلومت! یہ اللہ تعالیٰ کی تقسیم ہے جسے چاہے بلند کرے اور جسے چاہے پست، اس تقسیم پر راضی رہو۔''

''ارے جلیں ہمارے دشمن، ہم کیوں جلنے لگے، مگر ہماری ضد ہے کہ ہم تمہیں اپنے اوپر مزید حکمرانی نہیں کرنے دیں گے۔''

پیروں نے کہا اور پھر دونوں پاؤں نے ایڑی چوٹی کا زور لگانے کا عزم کیا۔

☆☆☆

شاہد کو آج کراچی سے لاہور سفر کے لیے روانہ ہونا ہے۔ شالیمار کی بوگی نمبر 5 سیٹ نمبر 73 اس کی محفوظ تھی۔ کراچی سے لاہور کا تھکا دینے والا سفر تھا اور پھر گاڑی بھی پانچ گھنٹے تاخیر سے چلی۔ اس نے آرام کی خاطر پاؤں پھیلا دیے۔ اچانک اسے اونگھ آ گئی اور نیند میں اس کے پاؤں سامنے بیٹھے مسافر کو زور سے جا لگے۔

''اے بھائی ہوش کر! پاؤں نہ مارو۔'' گاڑی کی تاخیر کی وجہ سے تھکے ہوئے دوسرے مسافر نے جو خود بھی تھکن کی وجہ سے سو رہا تھا، غصے میں اسے تنگ کر ٹھوکا لگاتے ہوئے کہا۔ ٹھوکا شاہد کے سر پر لگا۔

''اب مزا آیا...... اور ہمیں پھیلاؤ...... تم سے اسی طرح بدلہ لیں گے۔'' پیروں نے کہا۔

''کوئی بات نہیں...... میں اب ہوشیار ہو جاتا ہوں۔ جتنی میری چادر ہے اتنا ہی تمہیں پھیلاؤں گا۔''

اور پھر سر محتاط ہو گیا۔ وہ جاگتا رہا اور کھڑکی سے باہر ہرے بھرے لہلہاتے کھیتوں کو دیکھ کر لطف اندوز ہونے لگا۔ گاڑی بڑی تیزی سے اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھی۔ گاڑی تیز رفتاری کی وجہ سے ہچکولے بھی کھا جاتی۔ ایک مرتبہ تو گاڑی اتنی زور سے اچھلی کہ اوپر ریک میں رکھے ہوئے سامان میں سے ایک بیگ اس کے سر پر آ گرا۔ سامان میں کوئی نوک دار لوہے کی چیز تھی جس کے لگنے سے اس کا سر زخمی ہو گیا اور خون بہنے لگا۔ اس کی خوش قسمتی کہ قریب میں ایک ڈاکٹر صاحب بھی سفر کر رہے تھے اور ضروری سامان ان کے بیگ میں تھا۔ انہوں نے فوراً اس کی پٹی کر ڈالی۔ عام طور سے ایسا ہوتا نہیں بس یہ شاہد کی خوش قسمتی تھی۔

''تم دونوں بہت خوش ہوئے ناں؟'' سر نے پیروں کو مخاطب کیا۔

''کیوں نہیں...... اب ٹھکانے آیا ہو گا جناب کا دماغ......''

دونوں پیروں نے ہنستے ہوئے جواب دیا لیکن یہ بھی تو سوچو کہ اگر تمہارے چاہنے کے مطابق تم بلند ہوتے اور میں پست ہوتا، تو یہ چوٹ کس کو لگتی......؟ بتاؤ بتاؤ کسے لگتی......؟ تمہیں ہی لگتی ناں......! اب پتا چلا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں پست اور مجھے بلند کیوں کیا ہے۔'' سر نے دونوں پیروں کو سمجھایا۔

''اب مزا آیا...... ہم اب تک بدلہ نہ لے سکے، مگر اس کی تکلیف پہنچنے پر ہمیں سکون ملا'' پاؤں، سر کی تکلیف پر بہت خوش ہو گئے۔

''اے سنو! مجھے ایک بات ستا رہی ہے۔'' دائیں پیر نے بائیں پیر سے کہا۔

''وہ کیا......؟'' بائیں پیر نے تعجب سے پوچھا۔

''وہ بات بہت ہی عجیب ہے......'' دائیں پاؤں نے پھر کہا۔

''کیا عجیب ہے اس میں؟'' بائیں پاؤں نے حیرت سے پوچھا۔

''تم بھی سنو گے تو تعجب میں پڑ جاؤ گے۔'' دائیں پاؤں نے کہا۔

''مجھے تو فی الحال تم عجیب لگ رہے ہو جو پہیلیاں بوجھوا رہے ہو...... بھئی بتا بھی دو نا......'' بائیں پاؤں نے جھلا کر کہا۔

''وہ بات جو مجھے ستا رہی ہے اور کچوکے لگا رہی ہے وہ یہ ہے کہ اگر ہم سر کی جگہ ہوتے تو پھر؟'' سر کی کھری کھری باتوں نے دونوں پاؤں کو ایک لمحے کے لیے سوچنے پر مجبور کر دیا۔

''یار! مجھے تو ویسے ہی بہت ڈر لگتا ہے۔'' دائیں پیر نے کہا۔ خواہ مخواہ یہ سوچ کر یہ سر بلند کیوں؟ ہم پست کیوں ہیں یہ تو اللہ تعالیٰ کی تقسیم ہے۔ ہمیں حسد کی آگ میں نہیں جلنا چاہیے ''دیکھو! ہم پستی میں رہ کر کتنی خطرناک چیزوں سے بچ جاتے ہیں اور بلندی کی خواہش کرتے ہیں۔''

دونوں پاؤں نے سر کی باتوں کو ٹھنڈے ہو کر سوچا تو حق ان پر کھلتا چلا گیا۔

''یار بات تو تمہاری ٹھیک ہے اس چوٹ کو لگتے دیکھ کر ہمیں دشمنی سے باز آ جانا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے، کسے پست کرنا اور کسے بلند کرنا ہے۔'' اس مرتبہ بائیں پاؤں نے بھی اپنی ضد چھوڑتے ہوئے کہا اور پھر اگلے ہی لمحے دونوں نے سر سے صلح کرنے کے لیے اس کے سر ہو گئے۔

ان ناموں سے ہمیں یہ سبق ملا جس کو اللہ تعالیٰ نے بلند درجہ عطا فرمایا ہے اسے چاہیے کہ شکر ادا کرے اور جسے کوئی کم درجہ ملا ہے تو اسے چاہیے کہ ناشکری سے بچے۔

حسد کرنا اچھی بات نہیں۔ اس سے آدمی کی نیکیاں بھی ضائع ہوتی ہیں اور آپس میں نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ ☆☆

درج ذیل دیے گئے جوابات میں سے درست جواب کا انتخاب کریں۔

1۔ قائداعظم نے قانون کی ڈگری کب حاصل کی؟

i۔ 1893ء　ii۔ 1880ء　iii۔ 1897ء

2۔ قائداعظم نے آل انڈیا نیشنل کانگریس میں کب شمولیت اختیار کی؟

i۔ 1906ء　ii۔ 1905ء　iii۔ 1903ء

3۔ ذوالنورین (دونوروں والا) کس صحابیؓ کو کہا جاتا ہے۔

i۔ حضرت عثمانؓ　ii۔ حضرت علیؓ　iii۔ حضرت خالد بن ولیدؓ

4۔ پاکستان کا اوّلین بنک کون سا ہے؟

i۔ حبیب بینک　ii۔ مسلم کمرشل بینک　iii۔ نیشنل بینک

5۔ پاکستان کا قومی پھول چنبیلی ہے۔ اس پھول کا دوسرا نام کیا ہے؟

i۔ گل نرگس　ii۔ گل یاسمین　iii۔ گل حسن

6۔ سکے عام طور پر کس دھات سے بنائے جاتے ہیں؟

i۔ کانسی　ii۔ سلور　iii۔ تانبا

7۔ سورۃ التکاثر میں کون سا حرف ایک بار ہی استعمال ہوا ہے؟

i۔ ج　ii۔ ب　iii۔ الف

8۔ علامہ اقبالؒ کی دُعا ''یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے'' کس شعری مجموعے میں ہے؟

i۔ بانگِ درا　ii۔ بال جبریل　iii۔ ضرب کلیم

9۔ میانمر کا پرانا نام کیا تھا؟

i۔ برما　ii۔ سیام　iii۔ سیلون

10۔ شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد کہاں مدفون ہیں؟

i۔ کربلا گامے شاہ، لاہور ii۔ میانی صاحب، لاہور iii۔ مزار اقبال، لاہور

جوابات علمی آزمائش نومبر 2013ء

1۔ چار سورتیں 2۔ یثرب 3۔ بری امام 4۔ دو تلواریں 5۔ آم 6۔ پرندے کی فریاد 7۔ میدانِ عرفات میں 8۔ اسلام آباد 9۔ ارمغانِ حجاز 10۔ اگست 1945ء

اِس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے 3 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیے جا رہے ہیں۔

☆ احمد نسیم، ایبٹ آباد　(150 روپے کی کتب)

☆ حفصہ نور، گوجرانوالہ　(100 روپے کی کتب)

☆ فرحین علی خان، صوابی　(90 روپے کی کتب)

دماغ لڑاؤ سلسلے میں حصہ لینے والے کچھ بچوں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی:

سیف اللہ، منیبہ امجد، قصور۔ رمنا سعید، چیانوالی۔ سلیمان علی اعوان، واہ کینٹ۔ مدحت حامد، واہ کینٹ۔ زینب کامران، سرگودھا۔ محمد حمزہ مقصود، لاہور۔ محمد عبداللہ ہاشم، لاہور۔ محمد حذیفہ بن توقیر، ملتان۔ فائز محمد فاروق، کراچی۔ حمزہ اظہر، لاہور۔ ولید اشرف، گوجرہ۔ مریم صدیقہ، گوجرانوالہ۔ علینہ احمد، راول پنڈی۔ ثمرہ بٹ، گوجرانوالہ۔ محمد زین عظمت، گوجرانوالہ۔ ثمر خان، بھکر۔ راجہ محمد عمیر، راول پنڈی۔ محمد عبداللہ نیازی، بھکر۔ آمنہ فیاض، اسلام آباد۔ محمد عمیس، کلورکوٹ۔ روشن زیب، ایبٹ آباد۔ رانا بلال احمد، کوٹلہ۔ عبداللہ شاہ، دریا خان۔ عمیمہ عروج، ملتان۔ زینب محمود، گوجرانوالہ۔ تحریم مریم شاہد، ملتان۔ حوا ملک، لاہور۔ حافظ اسامہ ظفر، کمالیہ۔ محمد ہمایوں طارق، ملتان۔ خدیجۃ الکبریٰ، قصور۔ عبیہ جمیل، لاہور۔ حافظ عمیر بن عابد، حافظ آباد۔ ثانیہ بابر، چونیہ۔ عائشہ کریم، ملتان۔ اسد علی انصاری، ملتان۔ محمد جنید انجم، قصور۔ مریم سلیمان بٹ، گوجرانوالہ۔ آمنہ جبیں، اوکاڑہ۔ محمد زبیر عبیداللہ، شیخوپورہ۔ عامر سہیل، بھکر۔ محمد سلمان کمبوہ، محمد ریحان، خانیوال۔ صفی اللہ بٹ، شیخوپورہ۔ ثقلین عباس، کبیر والا۔ ہاجرہ عمران، گوجرانوالہ۔ علی طاہر، لاہور۔ محمد عرفان اقبال، دنیاپور۔ انیقہ فجر ظفر قریشی، میرپور آزاد کشمیر۔ حبیب بدر، بورے والا۔ شفق فاطمہ، راول پنڈی۔ سید نقیب الفضل ہاشمی، راول پنڈی۔ عروسہ شہباز، کرک۔ سیدہ ماہم نثار، واہ کینٹ۔ طٰہٰ یٰسین، لطیف آباد۔ ☆

بوجھو تو جانیں

1- کھولو تو سب کچھ دکھلائے
بند کرو تو سب کچھ مٹ جائے

2- تول میں تو پوری آئے
گھر لاتے لاتے گھٹ جائے

3- ڈبیا سے نکلا جس نے کھولی
چاندی کا پانی، سونے کی گولی

4- مٹھی میں وہ ڈھیروں آئیں
گننا چاہیں گن نہیں پائیں
(محمد افضل انصاری لاہور)

5- ایک تھال موتیوں سے بھرا
سب کے سر پہ اوندھا پڑا
جگمگ جگمگ تھال وہ کرے
موتی اس سے ایک نہ گرے

6- ایک ہے لال سی نانو بلی
وہ جس گھر میں خیر سے جائے
لاکھوں من پانی پی جائے
اور سامان سب گھر کا کھائے

7- نیلی سیج پہ گوری رانی
رو رو اپنی کہے کہانی
روئے تو عالم پھل لائے
ہنسے تو دُنیا جل جائے

8- ہم نے دیکھا اک پودا
سب سے الگ سب سے انوکھا
کھیت میں اس کا کام نہیں ہے
اتنی اونچی شاخ ہے اس کی
انسانوں کے منہ تک پہنچی
گو گو اس کی سانس میں دیکھی
نکلا دھواں اک سانس جو لے لی

9- کالی ماں کے گورے پوت
ان دونوں کے نئے کرتوت
بھائی کو بھائی سے لاگ
ایک ہے ٹھنڈا دوسرا آگ

10- ننھی سی بٹیا گلیلے سا پیٹ
آئے گا راجہ پھاڑے کا پیٹ

جوابات: 1۔آنکھ 2۔برف 3۔انڈا 4۔ریت کے ذرات 5۔آسمان 6۔آگ 7۔بارش، بجلی 8۔حقہ 9۔چاند، سورج 10۔چھالیہ، سروتا

راستہ ڈھونڈئیے

ننھا بھول بھلیوں میں پھنس گیا ہے۔ باہر جانے کے تین راستے ہیں۔ دو بند ہیں اور ایک کھلا ہے۔ بتائیے ننھا کس راستے سے نکل سکتا ہے؟

ہندسے ملائیں:

1 سے 20 تک لفظ ملایئے اور پھر رنگ بھریے۔ آہا! یہ کیا بن گیا؟

معلوماتِ عامہ

- قرآن پاک میں قسم توڑنے کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے۔
- حضرت جبرائیل علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس 40 مرتبہ آئے۔
- نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا جناب ابو طالب کا اصل نام عبدمناف تھا۔
- ہجرت مدینہ کے وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو اپنے بستر پر لٹایا۔
- حجتہ الوداع کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نو امہات المومنین تھیں۔
- معراج سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت میں تمام انبیاء علیہ السلام نے بیت المقدس میں نماز پڑھی۔
- خانہ کعبہ سے پہلے مسلمان بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے۔

(محمد افضل، راول پنڈی)

- سانحہ کربلا کے سب سے پہلے شہید مسلم بن عوسجہؓ تھے۔
- عربوں کی فتوحات کا آغاز مصر سے ہوا۔
- مکہ معظمہ کا پرانا نام بکہ یا بطحا تھا۔
- مشہور بزرگ حضرت میاں میرؒ کا اصل نام شیخ محمدؒ تھا۔
- حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کوہ ارارات پر جا کر ٹھہری تھی، یہ پہاڑ ترکی میں ہے۔

(عطاء الرحمٰن، کراچی)

- انسان کے بعد دُنیا کی ذہین ترین مخلوق ڈولفن مچھلی ہے۔
- خواتین کی آواز کی فریکونسی زیادہ ہوتی ہے۔
- انسانی زندگی کا جزواعظم پانی ہے۔
- خون کا او گروپ سب انسانوں کو دیا جا سکتا ہے۔
- دُنیا میں سب سے زیادہ دودھ روس میں پیدا ہوتا ہے۔
- کالے ناگ اور کوبرا کا زہر انسان کے نظام تنفس پر اثر انداز ہوتا ہے۔
- 150 پونڈ وزنی آدمی کے جسم میں 100 پونڈ پانی ہوگا۔
- دُنیا میں ہر ایک ہزار میں سے صرف ایک انسان سو سال کی عمر کو پہنچتا ہے۔

(سلیمہ سعید، ملتان)

- پانی اور خوراک کے بغیر انسان کم از کم تین دن زندہ رہ سکتا ہے۔
- وزن کے اعتبار سے آکسیجن انسانی جسم میں سب سے زیادہ پائی جاتی ہے۔
- پلوٹو سیارے پر دن کی لمبائی 6 دن 9 گھنٹے 54 سکینڈ ہے۔
- اہل مصر نے سب سے پہلے سال کو 12 مہینے اور 365 دن میں تقسیم کر کے کلینڈر بنایا تھا۔
- سطح سمندر پر ہوا کا دباؤ ساڑھے چودہ پونڈ فی مربع انچ ہوتا ہے۔
- تانبے کا پگھلاؤ کا درجہ حرارت 1083 سینٹی گریڈ ہے۔
- کسی جسم میں پائی جانے والی مقدار مادہ اس جسم کی کمیت کہلاتی ہے۔
- فلم پروجیکٹر بنانے والے سائنس دان کا نام ایڈیسن ہے۔
- آکسیجن اگر مائع کی شکل میں ہو تو اس کا رنگ زردی مائل نیلا ہوگا۔
- سب سے بھاری گیس ریڈون ہے۔
- چاند پر زمین کا سب سے بڑا سایہ مکمل چاند گرہن کے وقت پڑتا ہے۔
- ایک صحت مند آدمی کا دل ایک دن میں 103680 مرتبہ دھڑکتا ہے۔

(شہزاد محمد، پشاور)

- انسان میں رگوں کی تعداد ایک ہزار ہوتی ہے۔
- دل کی منتقلی کا پہلا آپریشن ڈاکٹر برنارڈ نے کیا۔
- صفرا چکنائی کو ہضم کرنے کا باعث ہوتا ہے۔
- جسم کے مختلف حصوں سے ناصاف خون جمع ہو کر دائیں اذن میں جاتا ہے۔
- دوسری اسلامی سربراہی کانفرنس 1974ء میں لاہور میں منعقد ہوئی۔
- بہاول پور کا فضائی حادثہ (سی۔130 ہرکولیس میں) 17 اگست 1988ء کو پیش آیا۔
- پاکستان میں اعشاری نظام یکم جنوری 1961ء کو رائج کیا گیا۔
- امینو ایسڈ کے علاوہ کولین کی کمی سے انسانی جگر میں کینسر ہو جاتا ہے۔

(سائرہ رفیق، اسلام آباد)

م	ی	د	ر	ی	ب	ش	ل	ق	ف
ف	ض	ج	ث	ڑ	ا	غ	ب	س	د
ر	ب	ز	ع	م	ر	ا	ن	ڈ	ی
ح	ط	ا	پ	ر	و	ث	ک	ع	و
ت	س	و	گ	ق	ا	ت	ش	م	ا
ک	ض	ن	ظ	ٹ	چ	ط	ے	پ	ج
ص	ی	ٹ	ح	ا	م	ی	د	ا	ے
ء	خ	ض	ا	ی	ر	ش	ن	س	ہ
خ	ڑ	ٹ	ن	س	چ	ی	ق	ل	ذ
ل	ی	م	ا	ج	ژ	گ	ح	م	ژ

آپ نے حروف ملا کر دس نام تلاش کرنے ہیں۔ آپ ان ناموں کو دائیں سے بائیں، بائیں سے دائیں، اُوپر سے نیچے اور نیچے سے اُوپر تلاش کر سکتے ہیں۔ آپ کے پاس وقت دس منٹ کا ہے۔ جن ناموں کو آپ نے تلاش کرنا ہے وہ یہ ہیں۔

عمران، جاوید، جمیل، حمید، فرحت، شبیر، نواز، مشتاق، اسلم، ریاض

ماموں وائی فائی کچھ سوچنے میں مصروف تھے۔ کافی دیر تک وہ سر کھجاتے رہے، اُن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مسئلے کا کیا حل نکالیں۔ ان کی ضرورت محض چالیس روپوں کی تھی اور اس وقت ان کے پاس صرف بارہ روپے موجود تھے۔ ایک بار پھر سر پر ہاتھ پھیرا تو انھیں یاد آ گیا کہ ان کے سر کے بال بڑھنا شروع ہو گئے ہیں اور اب وہ اس پر اُسترا پھروانا چاہتے تھے۔ انھیں اپنے سر پر بال مزہ نہیں دیتے تھے، اس لیے وہ کسی بھی طرح اپنی ٹنڈ کرانے کے موڈ میں تھے۔ انھوں نے اپنی ضرورت کے لیے اپنے ابا کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ ابن پودینہ ایسی نگاہوں کو خوب سمجھتے تھے۔ انھوں نے ماموں وائی فائی کی جانب دیکھنے کے بجائے فوراً چھت کو گھورنا شروع کر دیا۔ ماموں بھی سمجھ گئے کہ یہ حسبِ عادت کچھ نہیں دیں گے۔

ان کے ذہن میں کوئی منصوبہ آ گیا تھا اس لیے انھوں نے گھر سے باہر نکلنے میں دیر نہیں لگائی۔ کچھ ہی دیر میں وہ جاوید باربر کی دُکان کے آگے اپنے موبائل پر خالی خولی کے ایکشن دینے لگے۔ وہ اسے یہ باور کرا رہے تھے کہ جیسے فون پر بہت زیادہ مصروف ہوں۔ جاوید اپنے گاہک کے بال کاٹتے کاٹتے ماموں کی حرکتوں پر بھی نظر رکھے ہوئے تھا۔ ایک بار وہ تولیہ لینے باہر کی جانب آیا تو ماموں کی مصروفیت دیکھ کر بولنے پر مجبور ہو گیا۔

''کبھی ہماری طرف بھی نظر کرم کر دیا کریں ماموں؟''

''جی فرمایئے! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' ماموں کو اپنا کام ہوتا ہوا نظر آیا۔

''سنا ہے آپ دُور دراز کی کالیں وائی فائی کے ذریعے لوگوں کو مفت کرا دیتے ہیں۔'' اس نے مسکین سی صورت بنا کر کہا۔

''یہ بھی کوئی مسئلہ ہے کیا!'' ماموں نے اٹھلاتے ہوئے کہا۔ ''اپنے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے یہ تو۔'' انھوں نے مزے سے چٹکی بجائی۔

''اپنا ایک جگری یار ہے دُبئی میں!'' جاوید کہہ رہا تھا۔ ''یہی کام کرتا ہے باربری کا۔ بہت دل کرتا ہے میرا اس سے بات کرنے کو۔'' وہ جوش سے بولا۔ ''مگر کال بہت مہنگی پڑتی ہے دوست۔'' اب اس کے چہرے پر افسردگی پھیل چکی تھی۔

''تمھارا یہ بھائی کس کام آئے گا۔'' اب ماموں کا کام بننے کے سو فی صد چانسز بن چکے تھے۔ ''بس! یہ ہے کہ رات کو فرصت سے بات کراؤں گا کسی ہوٹل کے باہر!''

وہ بے حد خوش ہو گیا۔ ماموں نے جھوٹی تسلی کے لیے اس

سے نمبر لے کر ایک دو میسیج اس کے دوست کو پہنچانے کو کہا۔ وہ جانتے تھے کہ ملک سے باہر پیغام بھیجنے کے چھے روپے جمع ٹیکس لگ جاتے ہیں۔ ان کے پاس کون سا بیلنس ہوتا تھا کہ وہ واقعی اس کے دوست کو میسیج کرتے۔ انھوں نے مقامی دوست کو دو ایک میسیج کیے جس کا جواب بھی آیا تو انھوں نے بھولے بھالے باربر جاوید کو آسانی سے خوش کردیا۔

''آپ کی بڑی مہربانی ماموں! ٹھنڈا تو پی جائیں۔''

''ٹھنڈا...... نہیں وہ ٹنڈ......'' ماموں نے چونک کر بوکھلانے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

''کیا ٹنڈ کر دوں؟ یہ بھی کوئی مسئلہ ہے کیا؟'' اس نے بھی ان کے انداز میں کہا اور ماموں اپنی اس ہوشیاری پر دل ہی دل میں مسکرا کر رہ گئے۔

ماموں نے اس کو وائی فائی کے شیشے میں ایسا اُتارا کہ اس نے نہ صرف مفت میں ان کی ٹنڈ کر دی بلکہ چائے بھی پلائی، وہ خوش خوش اپنی ٹنڈ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پارک کی جانب چل دیے۔ ان کے سر کو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا لگی تو ان کا دل بے حد خوش ہو گیا۔ اب وہ کسی کیس کو نمٹانے کے موڈ میں تھے۔

ویسے وہ اپنے شہر کے اس جناح پارک میں اکثر ہوا خوری کے لیے آتے تھے۔ ان کے والد ابن پودینہ کا بھی شروع سے یہی طریقہ تھا۔ انھوں نے اپنے بیٹے کو بھی یہیں کی صاف ستھری، مفت تفریح کرائی تھی۔ نہ ہوا پر کوئی ٹیکس تھا اور نہ ہی بنچوں پر بیٹھنے کی کوئی فیس! ماموں کو تو بنچوں پر چپس کی تھیلیاں اُٹھا کر مشکوک انداز میں دیکھنے کی عادت تھی۔ ایسے میں اُنھیں مختلف پیکٹ میں دو چار چپس کے ٹکڑے بھی رکھے مل جاتے تھے جسے وہ بڑے مزے سے یوں کھا لیتے تھے جیسے تھیلی انھوں نے ہی خرید کر کھائی ہو۔ کئی بار تو انھیں بچوں کی گرائی ہوئی ٹافیوں اور بسکٹ کے ثابت پیکٹ بھی مل جاتے تھے جسے وہ جھوم جھوم کر کھاتے تھے اور ان کے ریپر اس انداز سے ڈسٹ بن میں ڈالتے تھے جیسے سو پچاس روپے خرچ کر کے سب کچھ خود سے خرید کر کھایا ہو۔

آج انھوں نے اوپر نیچے اُچک اُچک کر مختلف بنچوں پر دیکھا لیکن مفتے کی کوئی چیز نہ ملنا تھی، نہ ملی۔ وہ اس بات پر بے حد افسردہ تھے۔ ابھی انھیں اس طرح بنچوں کی تلاشی لیتے ہوئے کچھ دیر ہی گزری تھی کہ اچانک ایک آواز نے انھیں چونکا دیا۔

''میاں برخوردار...... بات دراصل یہ ہے کہ......''

''جی فرمائیے......'' ماموں وائی فائی نے اپنے آپ کو درست کرتے ہوئے کہا۔ وہ اجنبی کو پہچاننے کی کوشش میں ناکام رہے تھے۔ ''ویسے میں نے آپ کو پہچانا نہیں!'' ''پہچانو گے کیسے منے۔ میں تو کئی سال بعد اس شہر میں واپس آیا ہوں۔''

''اچھا!...... مگر کس لیے آئے ہیں؟'' ماموں نے زور دے کر کہا۔

''میرے پاس چپس کی دو تھیلیاں تھیں، میں نے سوچا، دوسری کس کو کھلاؤں!'' وہ خود سے زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے بولے۔

''پھر ملا آپ کو کوئی دوسرا فرد!'' ماموں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔

''ارے بھئی تم ہو ناں اس کے مستحق۔'' وہ جھوم جھوم کر کہنے لگے۔ ''تم کافی دیر سے اپنی چپس تلاش کر رہے تھے، میں نے سوچا کہ تمھیں ہی چپس کا تحفہ پیش کروں۔'' یہ کریم بھائی تھے جو ان کے مزے لے رہے تھے۔

''اچھا......'' اُنھوں نے ایک دم جھینپ کر کہا۔ اب انھیں مفت میں کھانے پینے کو چیز مل رہی تھی تو وہ انکار کیوں کرتے۔ انھوں نے چپس کی تھیلی لینے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

''بات دراصل یہ ہے کہ میں نے چپس کی سپلائی کے لیے ایجنسی لی ہے۔'' وہ بتا رہے تھے۔ ''جب میرا مال بچ جاتا ہے تو میں اِدھر اُدھر جا کر یہ تقسیم کر دیتا ہوں۔'' وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ ''خراب کر کے پھینکنے سے تو بہتر ہے ناں۔''

''کیا مطلب آپ کا......؟'' ماموں کا ہاتھ چپس کی تھیلی سے ایک دم باہر نکل آیا۔ انھوں نے دیکھا کہ کریم بھائی نے اپنی تھیلی قطعی نہیں کھولی تھی۔ ''آپ مجھے باسی مال کھلا رہے ہیں!'' یہ کہہ کر انھوں نے تھیلی ان کی طرف واپس بڑھانا چاہی۔

''تم تو سنجیدہ ہو گئے۔ میں تو یوں ہی مذاق کر رہا تھا۔'' یہ کہہ کر انھوں نے وضاحت کرنا شروع کر دی۔ پھر کہنے لگے۔ ''بیٹا! دراصل میں اس چپس کی مارکیٹنگ کے لیے بہت پریشان ہوں، مجھے اس کام کے لیے تمھاری مدد کی ضرورت ہے۔'' انھوں نے

اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''اگر تمھاری مدد مل جائے تو کیا ہی کہنے۔''

''اچ چ چھا..... مگر کیسی مدد؟'' وہ چونک کر بولے۔

''میں تمھیں اس چپس کے لیے مارکیٹنگ مینیجر بنانا چاہتا ہوں۔''

''مارکیٹنگ مینیجر.....'' انھوں نے آنکھیں مسلتے ہوئے کہا۔ انھیں اس کی بات کا یقین نہیں آیا تھا۔

''ہاں ہاں! مارکیٹنگ مینیجر..... تمھاری شخصیت ہے ہی ایسی.....''

کریم بھائی نے ان کی تعریف کی تو وہ پھولے نہ سمائے اور انھوں نے اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیر پھیر کر اپنے آپ کو فلم اسٹار محسوس کرنا شروع کر دیا۔

''لیکن مجھے اس کام کا، کوئی تجربہ بھی۔'' وہ تھوڑا سا شرما کر بولے۔

''ارے تجربہ جائے بھاڑ میں!'' انھوں نے ماموں کے کاندھے پر بے تکلفی سے ہاتھ مار کر کہا۔ وہ اس اچانک حملے پر ایک طرف سے دوسری طرف گھوم گئے۔ انھوں نے اپنا کاندھا دبانا شروع کر دیا لیکن منہ سے کچھ نہ بولے۔

''تمھیں صرف یہ کرنا ہوگا کہ پبلک مقامات پر اور اسی طرح کے پارکوں میں لوگوں کو چپس کے سیمپل مفت کھلانا ہوں گے کہ لوگ اس پراڈکٹ کی طرف راغب ہو جائیں۔''

''ٹھیک اور مجھے ملے گا کیا.....؟'' اب وہ کام کی بات کی طرف آئے۔

''اگر تم نے ہماری مرضی کے مطابق کام کیا تو دس ہزار روپے ماہانہ۔''

''دس ہزار روپے.....؟'' ماموں وائی فائی بے ہوش ہوتے ہوتے بچے۔ ''اس کے علاوہ بونس وغیرہ بھی ہوگا۔''

''بس بس! میں تیار ہوں۔''

انھیں تو کوئی دو ہزار روپے میں ملازم رکھنے کو تیار نہیں ہوتا تھا اور اچانک سے قدرت ان پر اس قدر مہربان ہو گئی تھی۔ ماموں نے اُن کی خواہش کا جواب آنکھوں ہی آنکھوں میں دیا۔ پھر انھوں نے ان سے چپس لے کر مارکیٹنگ مینیجر کی ذمہ داریاں نبھانے میں کوئی خاص دیر نہیں لگائی۔

آج ماموں وائی فائی کو کریم بھائی نے سائٹ ایریا کے ایک پارک میں مارکیٹنگ کے لیے روانہ کیا تھا۔ ان کی خاصی عزت افزائی تھی۔ کمپنی نے دو لڑکے ان کے ساتھ کر دیے تھے جو ان کی معاونت کے لیے ہر وقت حاضر رہتے تھے، انھیں چپس کے پیکٹ تک نہیں اُٹھانا پڑتے تھے۔ وہ صرف اپنی زبان سے لوگوں کو راغب کرتے، کمپنی کی مشہوری کرتے اور کسی کسی کو پیکٹ سے نواز کر آگے نکل جاتے۔ وہ اپنا کام کر کے الگ کسی گوشے میں نکل جاتے تھے۔ انھوں نے ان لڑکوں کو کوئی خاص فری نہیں کیا تھا۔ وہ دو دو ہزار کے ملازم تھے اور یہ ٹھہرے دس ہزار کے مارکیٹنگ مینیجر، تو کچھ فاصلہ تو ضروری تھا۔ وہ دونوں بھی ان کے آگے نکلتے ہی سرک جاتے تھے۔ یوں ان کی افسری کا بھرم بھی قائم تھا۔

''دیکھیے! یہ ہے ہماری اعلیٰ کوالٹی کی بمبار چپس..... ایک بار کھایئے، بار بار مانگیے۔ بمبار چپس..... نام لے کر کھائیں، دھوکا بالکل نہ کھائیں!''

وہ بہترین انداز میں پبلسٹی کر کے لوگوں کے دل موہ رہے تھے اور ان میں چپس بھی تقسیم کر رہے تھے۔ جب وہ تھک گئے تو ایک درخت کے ساتھ لگی بنچ پر جا کر لیٹ گئے۔ ان کے ساتھی الگ نکل گئے۔ ابھی انھیں لیٹے ہوئے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ ایک کرخت آواز نے انھیں چونکا دیا۔ ''اوہ! اٹھو بھائی۔''

''جی..... کون..... جی!'' وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔

''تو تم ہی ہو وہ سیلز مین جو بمبار چپس لوگوں کو مفت کھلاتے پھر رہے ہو؟''

''جی جی! آپ بھی کھایئے گا۔'' وہ خوش ہو کر بولے۔ وہ ان کے جواب کے منتظر تھے۔

''ہم تمھاری چپس کھائیں گے نہیں بلکہ تمھیں کھلائیں گے جوتے۔''

''ارے ارے! میں تو آپ کے ساتھ عزت سے پیش آرہا ہوں اور آپ نے یہ کون سی زبان شروع کر دی۔'' وہ ایک دم سے چڑ گئے۔ وہ مارکیٹنگ مینیجر تھے کوئی مذاق بات نہیں تھی۔

''بڑے آئے مارکیٹنگ مینیجر! ابھی لے کر چلتا ہوں تمھیں سی آئی اے سینٹر.....''

''سی آئی اے سینٹر.....'' وہ ایک دم گڑبڑا گئے۔
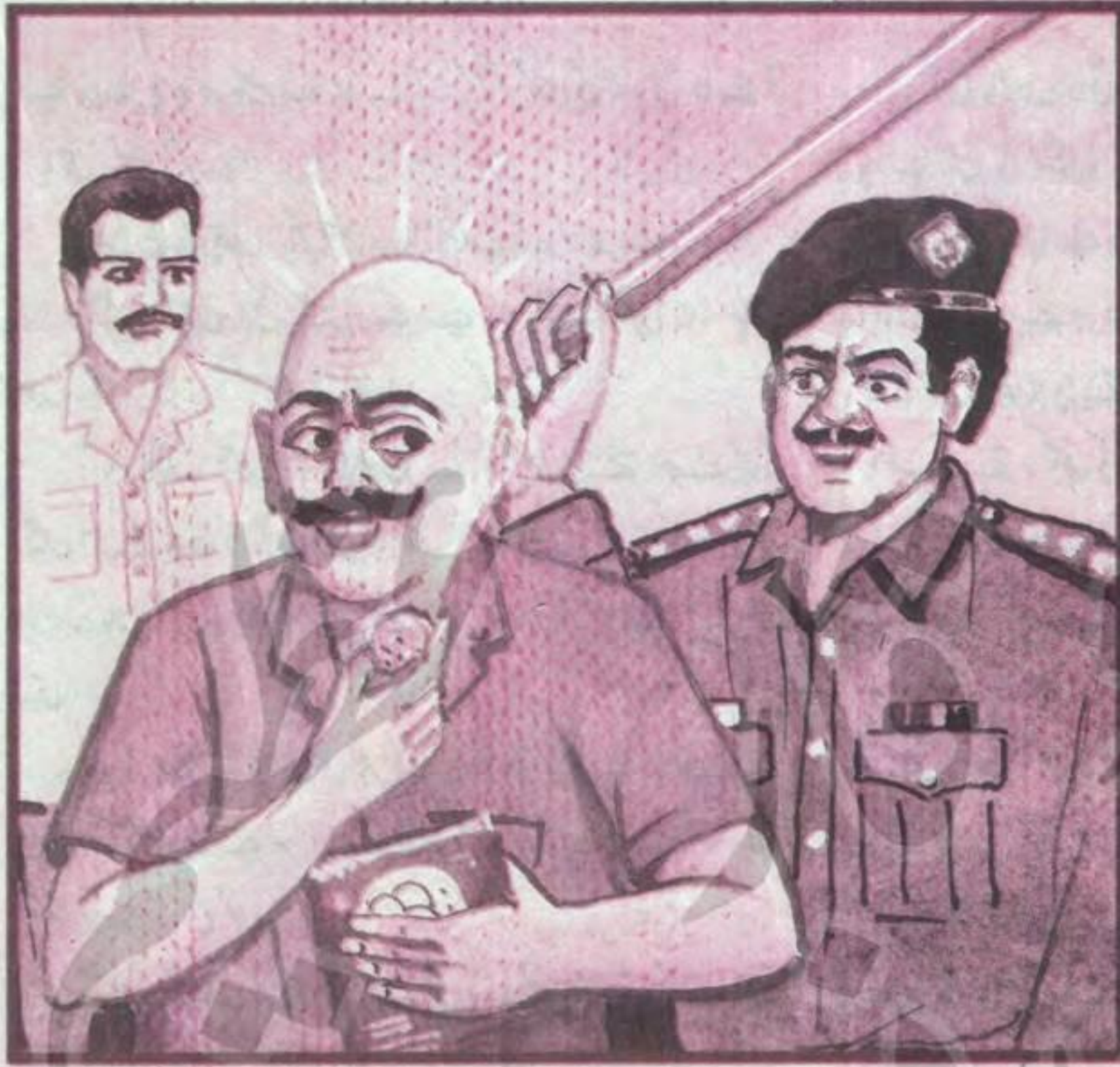
''ہاں میں ہوں ہوں انسپکٹر دلاور......تم چلو میرے ساتھ......''

یہ کہہ کر اس نے ماموں کا بازو پکڑ کر تیزی سے کھینچا اور انھیں بنچ سے اٹھا کر کھڑا کر دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے یا کچھ سمجھنے کی کوشش کرتے، اس نے انھیں بازو سے پکڑ کر گھسیٹا اور باہر دروازے پر کھڑی جیپ میں بٹھا دیا۔

ماموں بہت کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ چپس بیچنا بلکہ مفت میں تقسیم کرنا کس طرح جرم بنا، یہ ان کی خود سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ انسپکٹر کچھ بتانے کے موڈ میں نہیں تھا۔ سارا راستہ خاموشی میں نکلا۔ اس کا کہنا تھا کہ اب جو بات ہوگی وہ سی آئی اے سینٹر میں ہوگی۔

سینٹر پہنچنے کے کچھ ہی دیر بعد تین چار لوگ ان کے سامنے بلائے گئے۔ ماموں پہچان چکے تھے کہ یہ کون لوگ ہیں؟

''یہی ہے وہ گنجا لڑکا!'' ان میں سے دو افراد زور سے چیخے جب کہ باقی دو نے ہلکی آواز میں یہی جملہ دُہرایا تو ماموں کی پیشانی پر سلوٹیں ابھر گئیں۔ ان کی سمجھ سے باہر تھا کہ جن افراد کو پچھلے ہفتے انھوں نے مفت میں بمبار چپس کی سیمپل تھیلیاں تقسیم کیں تھیں وہ ان سے اس قدر ناراض کیوں ہیں کہ انھیں یہاں بلوا کر ان کی عزت افزائی کر رہے ہیں، جب کہ انھوں نے تو مفت میں چپس کھلا کر ان کے ساتھ بھلائی کی تھی۔

''دیکھ لو! بات ثابت ہوگئی کہ تم لوگوں کو نشہ آور چپس کھلاتے ہو؟'' انسپکٹر نے غصے سے آنکھیں نکالیں۔

''نشہ آور چپس!'' ان کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں!''

''زیادہ بھولے نہیں بنو میرے سوہنے بادشاہ!'' ان میں سے ایک بولا۔

''میرا تو پچیس ہزار والا موبائل گیا ہے۔''

''میری بیوی کا شاپنگ والا تھیلا لے گیا ہے یہ گنجا۔''

''اور میرا کیش...... اور...... اور......''

ماموں اب بھی کچھ سمجھنے سے قاصر تھے۔

''تم نشے والی چپس مفت کھلا کر لوگوں کو بے ہوش کرتے ہو اور پھر ان کی غفلت کا فائدہ اُٹھا کر وارداتیں کرتے ہو۔'' انسپکٹر نے اسٹک اٹھا کر اپنی ہی ٹانگ پر زور سے ماری۔ اُن کے منہ سے ہلکی سی کراہ بھی نکل گئی۔

''کیسی وارداتیں سر!'' ماموں نے حیرانی سے کہا۔

اس پر ایک بھرپور ہاتھ انھیں پڑا۔ انھیں بالکل بھی سمجھ میں نہیں آسکا تھا کہ کسی مجرمانہ گروپ نے انھیں نوکری کا جھانسا دے کر اپنے غلط مقاصد کے لیے قابو کر لیا تھا۔ وہ تو چپس دے کر آگے نکل جاتے تھے جب کہ چپس لے کر ان کے ساتھ چلنے والے لڑکے مدہوش ہو جانے والے افراد کے بیگ، نقدی یا موبائل جو ان کے ہاتھ لگتا تھا، لے کر فوراً غائب ہو جاتے تھے۔ اب پھنس گئے ایسے میں ماموں وائی فائی۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ سر منڈواتے ہی ایسے زبردست اولے پڑیں گے کہ انھیں بچانے والا بھی کوئی نہیں ہوگا! ☆☆

انعامی سلسلہ

سوال یہ ہے کہ.......!

۱۔ اَلْوَّاقِعُ کے کیا معنی ہیں؟

۲۔ قومی یادگار قائداعظم ریذیڈنسی میں قائداعظم نے کتنے ایام گزارے؟

۳۔ نانگا پربت کس علاقے میں ہے؟

۴۔ آغا شورش کاشمیری نے کب وفات پائی؟

۵۔ خواتین کی ہاکی ٹیم کا پہلا میچ کہاں کھیلا گیا؟

۶۔ حضرت امام حسینؓ کا مزار کہاں واقع ہے؟

درج بالا سوالوں کے جوابات دسمبر 2013ء کے شمارے میں موجود ہیں۔ آپ رسالہ غور سے پڑھیے اور اپنے جوابات لکھ بھیجئے۔ درست جواب دینے والے تین خوش نصیبوں کو 300 روپے کی انعامی کتب دی جائیں گی۔ تین سے زیادہ درست حل آنے کی صورت میں بہ ذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیے جائیں گے۔

نومبر 2013ء میں بہ ذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کے نام:

1۔ محمد عقیل، جہلم | 2۔ علینہ اظہر، اسلام آباد | 3۔ افتخار احمد، پشاور

کھوج لگایئے

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 دسمبر 2013ء ہے۔

نام: ____

شہر: ____

مکمل پتا: ____

موبائل نمبر: ____

آیئے عہد کریں

کوپن ارسال کرنے کی آخری تاریخ 10 دسمبر 2013ء ہے۔

نام ____ مقام ____

میں عہد کرتا/کرتی ہوں کہ ____

موبائل نمبر: ____

سوال یہ ہے کہ......!

کوپن ارسال کرنے کی آخری تاریخ 10 دسمبر 2013ء ہے۔

نام ____ عمر ____

مکمل پتا: ____

موبائل نمبر: ____

دماغ لڑاؤ

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 دسمبر 2013ء ہے۔

نام: ____

مقام: ____

مکمل پتا: ____

موبائل نمبر: ____

ہونہار مصور

دسمبر کا موضوع مزار قائداعظم ارسال کرنے کی آخری تاریخ 08 دسمبر 2013ء ہے۔

نام ____ عمر ____

مکمل پتا: ____

موبائل نمبر: ____

میری زندگی کے مقاصد

کوپن پُر کرنا اور پاسپورٹ سائز رنگین تصویر بھیجنا ضروری ہے۔

نام ____ شہر ____

مقاصد ____

موبائل نمبر: ____
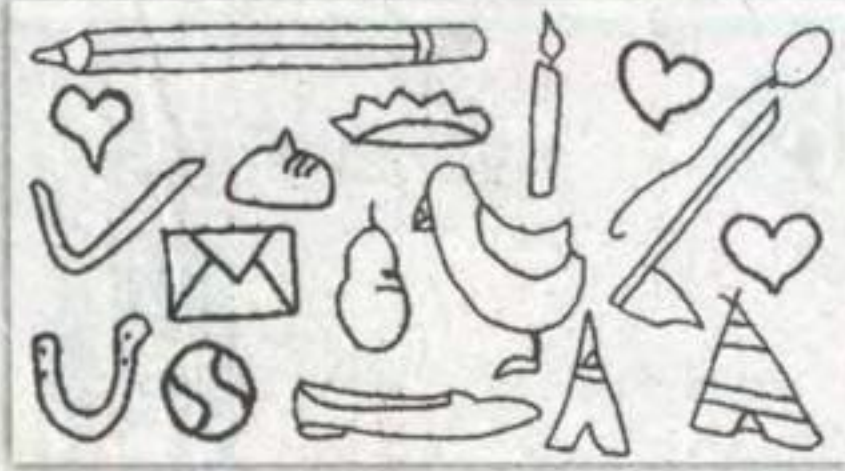
یہ چیزیں خاکے میں چھپی ہوئی ہیں۔ آپ ان چیزوں کو تلاش کیجئے اور شاباش لیجئے۔

زیارت ریذیڈنسی...... صرف لکڑی اور مٹی کی بنی ہوئی عمارت ہی نہیں بلکہ بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح سے عقیدت و محبت کی ایک علامت بھی ہے۔ یہ قومی یادگار 1892ء میں بنائی گئی تھی۔ صنوبر کے جنگلات کی موجودگی اور ایک پُرسکون و پُرفضا مقام ہونے کی وجہ سے زیارت ریذیڈنسی کے لیے اس جگہ کا انتخاب ہوا۔ برطانوی دور کے افسروں کے قیام و آرام کے لیے یہ عمارت تعمیر کی گئی تھی جسے بعد میں گورنر جنرل کے ایجنٹ کی موسم گرما کے لیے رہائش گاہ بنا دی گئی۔ اس عمارت کی تاریخی اہمیت میں اضافہ اس وقت ہوا جب قائداعظم محمد علی جناح نے اپنی زندگی کے آخری ایام یہاں گزارے۔

وادیٔ زیارت میں واقع یہ خوب صورت عمارت قائداعظم کے آخری دنوں کی کہانی سناتی ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس جگہ کے ماحول اور قائداعظم کی باوقار شخصیت میں بلا کی مماثلت تھی۔ یہاں کے جنگل میں بھی ایک ڈسپلن موجود ہے۔ یہاں شور شرابے سے ہٹ کر اونچی آواز میں بات کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ چنانچہ ایک مکمل سکوت اور خاموشی اس عمارت اور اردگرد کے ماحول کی خوبصورتی میں اضافہ کرتی ہے۔ قائداعظم کو اس مقام اور یہاں کی خاموشی سے گہرا لگاؤ تھا۔ اس کا ذکر مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح نے اپنی کتاب ''مائی برادر'' میں بھی کیا ہے۔ اس شان دار عمارت میں ہی ہماری قومی تاریخ کا ایک پورا باب قلم بند ہوا۔ یہاں قیام کے دوران بابائے قوم سرحد کے اطراف ہونے والے قتل عام پر پریشان تھے۔ ان کے پیشِ نظر اس وقت اہم مسئلہ ملک کی قیادت کا تھا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ ان کے بعد ملک کی قیادت کون سنبھالے گا اور کیا ملک کو ایسی قیادت میسر آسکے گی جو پاکستان کو ترقی کی راہ پر ڈال سکے؟ چنانچہ بہت سے سیاسی رہنماؤں نے مشاورت کے لیے زیارت کی اس ریذیڈنسی کا رُخ کیا، جہاں ٹی بی کے مرض کے شکار اس قوم کے لیڈر کی صحت تیزی سے گر رہی تھی۔

زیارت میں داخل ہونے والی مین سڑک سے دائیں ہاتھ ایک سڑک اوپر کی طرف جاتی ہے جس کے پہلو ایک بورڈ پر تیر کے نشان سے قائداعظم ریذیڈنسی کی نشان دہی کی گئی ہے۔ یہ ریذیڈنسی دراصل وائسرائے ہند کا زیارت میں متبادل گھر تھا۔ ریذیڈنسی کے دروازے پر اس کی تاریخ درج ہے۔ عمارت کے وسیع و عریض صحن کے دائیں بائیں بڑی خوبصورتی سے تراشی گئی گھاس کے لان ہیں۔ مختلف رنگ برنگے پھولوں اور چنار کے درختوں نے انتہائی

خوب صورت اور دلکش ماحول بنا رکھا ہے۔ سیڑھیاں چڑھ کر برآمدے سے دیکھیں تو دُور تک کا نظارہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ صنوبر کی لکڑی سے تعمیر شدہ یہ ایک انتہائی دلکش عمارت ہے۔ عمارت کے اندر لکڑی کا کام انتہائی نفاست سے کیا گیا ہے۔ فرش، در و دیوار اور چھت سب لکڑی کے بنے ہوئے ہیں۔ عمارت کے اندر داخل ہوں تو آگے پیچھے اور اوپر نیچے چار چار کمرے ہیں۔ دائیں طرف والے کمرے میں دو میزیں اطراف میں ہیں۔ ایک درمیان میں ہے، اس کے ساتھ چار کرسیاں موجود ہیں۔ یہاں قائداعظم کھانا کھاتے تھے۔ اسی کمرے میں لکڑی کا ایک اسٹینڈ ہے جس میں پیتل کا تھال لٹکا ہوا ہے۔ یہ گھنٹی کا کام دیتا ہے۔ اس زمانے میں زیارت میں بجلی نہ تھی۔ اس لیے تھال بجا کر گھنٹی کا کام لیا جاتا تھا اور ویٹر کو بلایا جاتا تھا۔ اس کمرے میں قائداعظم اور تحریکِ پاکستان کی تصاویر، قائد کا لباس، شیروانی، کوٹ وغیرہ کی بھی تصاویر ہیں۔ اس کمرے کے بالکل سامنے بائیں طرف والا کمرہ قائداعظم سے مہمانوں کی ملاقات کے لیے مختص تھا۔ دائیں طرف کے پہلے کمرے کے پیچھے والے کمرے میں قائد کے پرائیویٹ سیکرٹری بیٹھتے تھے۔ ان چاروں کمروں کے درمیان راہداری میں چوبی زینہ ہے۔ بائیں ہاتھ لکڑی کا بل کھاتا ہوا یہ زینہ آپ کو دوسری منزل پر لے جاتا ہے۔ اوپر بھی نیچے کی طرح دائیں بائیں دو، دو کمرے ہیں۔ بالائی منزل پر بائیں ہاتھ کا پہلا کمرہ قائداعظم کا بیڈروم تھا جب کہ دائیں ہاتھ کا پہلا کمرہ جو قائد کے بیڈروم کے بالمقابل ہے، پر ان کی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح کا بیڈروم تھا۔ اس کمرے کا دروازہ کھلا ہو تو قائد کا بیڈ روم واضح دکھائی دیتا ہے۔ یہ شاید اس لیے تھا کہ بانیٔ پاکستان کی ہمشیرہ ہمہ وقت اپنے بھائی کی صحت کے لیے فکر مند اور ان کی تیمارداری میں پیش پیش تھیں۔

بانیٔ پاکستان کے بیڈروم میں ایک ڈریسنگ ٹیبل ہے جب کہ دوسری طرف کرسی میز ہے، جہاں وہ اپنے بیماری کے ایام میں حکومتی فرائض سرانجام دیتے تھے۔ اس بیڈروم سے ملحق باتھ روم ہے۔ اب اسے ایک کمرے کی شکل دے دی گئی ہے اور اس میں بانیٔ پاکستان کے دورِ جوانی کی تصاویر لگی ہیں۔ اس طرح لکڑی کی وہ ٹوکری بھی موجود ہے جو اکثر قائد کے استعمال میں رہتی تھی۔

یہ ریذیڈنسی، جہاں قائداعظم محمد علی جناح نے اپنی زندگی کے آخری دو ماہ اور دس یوم گزارے، سطح سمندر سے تقریباً آٹھ ہزار فٹ بلند ہے۔ 1892ء میں اس کی تعمیر پر کم و بیش 39012 روپے خرچ ہوئے تھے۔ گورنر جنرل کے نمائندگان اور چیف کمشنر یہاں گرمیوں کی چھٹیاں گزارتے تھے۔ قائداعظم کے آخری ایام یہاں گزارنے کے باعث اس عمارت کو خاص اہمیت حاصل ہوگئی۔ چنانچہ 1985ء میں جنرل محمد ضیاء الحق نے اسے قومی یادگار قرار دے دیا۔ اسے آثارِ قدیمہ کی فہرست میں شامل کیا گیا اور اس عمارت کا نام قائداعظم ریذیڈنسی قرار پایا۔ 7 جنوری 1989ء کو سینٹ آف پاکستان نے اس کی حتمی منظوری دے دی۔

عمارت کے صدر دروازے سے سیڑھیوں پر آئیں تو یہاں سے آپ کو دُور دُور تک صنوبر کے درختوں کا انتہائی دلکش منظر دکھائی دیتا ہے۔ صحن میں سبزے اور پھولوں نے اس عمارت کے حسن کو مزید بڑھا دیا ہے۔ صنوبر کے درخت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ سب سے زیادہ سست رفتاری سے بڑھنے والا درخت ہے۔ بعض کے نزدیک تو یہ ایک صدی میں ایک سے تین انچ تک بڑھتا ہے۔ اس سے ان درختوں کی عمر کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

قائداعظم کو آخری ایام میں پھیپھڑوں کی تکلیف ہوگئی تو اس مرض کے لیے یہ پہاڑی مقام اور فضا آپ کے لیے بہترین جگہ قرار پائی۔ یہ جگہ اور عمارت قائداعظم کو بہت پسند تھی اور یہاں ان کی حالت بہتر ہونے لگی تھی۔ قائداعظم اور زیارت ریذیڈنسی کے ایک کمرے میں سخت علالت کے دنوں میں بھی اپنے بستر کے آس پاس موجود فائلوں کا ڈھیر دیکھتے رہتے تھے۔ وہ فائلیں جو بلوچستان کے پاکستان کے ساتھ الحاق سے متعلق تھیں، ان میں بلوچی سرداروں نے پاکستان کے ساتھ رہنے پر رضا مندی ظاہر کی تھی۔ پہاڑوں کی بلندی پر واقع اس ریذیڈنسی کے احاطے میں بادام، چیری، سیب، اخروٹ اور قندھاری درخت جھومتے تھے۔ اس خوبصورت اور خواب جیسی جگہ پر بیٹھ کر بابائے قوم نے فرمایا تھا۔

''زیارت مجھے بہت پسند ہے، اسے ایک خوبصورت شہر بنایا جا سکتا ہے جس میں ہر جگہ بڑے آرام دہ ہوٹل، خوبصورت بنگلے اور پارک ہوں، پھولوں سے بھرے ہوئے باغ باغیچے ہوں۔'' ☆☆

باپ: بیٹا! امتحان میں سوال مشکل تو نہیں تھے؟
بیٹا: ابا جان! سوال تو نہیں مگر جواب بہت مشکل تھے۔
(اقراء محمود، بورے والا)

ایک ٹرک دوسرے ٹرک کو رسّی سے باندھ کر لے جا رہا تھا۔ ایک آدمی ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گیا اور کہنے لگا: ایک رسّی کو لے جانے کے لیے دو ٹرک۔
(حفصہ اعجاز، ٹوپی صوابی)

جج (ملزم سے): "تمھیں صبح پانچ بجے پھانسی دی جائے گی۔" ملزم ہنسنے لگا۔
جج: "تم کیوں ہنس رہے ہو؟"
ملزم: "جناب! میں اٹھتا ہی نو بجے ہوں۔"
(نبیہہ، لاہور)

استاد (شاگرد سے): اگر تم مغرب کی طرف چلتے رہو تو کہاں پہنچو گے؟
شاگرد: جناب میں غروب ہو جاؤں گا۔
(طلحہ عزیز، کراچی)

ایک شخص روزانہ خواب میں فٹ بال کھیلتا تھا۔ اسے ماہر نفسیات کے پاس لے جایا گیا۔ ماہر نفسیات نے اس کا معائنہ کیا اور کہا: "آج خواب کے دوران یہ گولی جاگ کر کھا لیں۔"
اس شخص نے جواب دیا: "آج تو ہرگز نہیں کھاؤں گا کیوں کہ آج تو فائنل ہے۔"
(کلثوم، گجرات)

چار چوہے درخت کی شاخوں پر بیٹھے گپیں لگا رہے تھے کہ جنگل کے درختوں میں سے ایک ہاتھی نمودار ہوا اور اس درخت کے نیچے سے گزرا جس پر چوہے بیٹھے تھے۔ اچانک ایک چوہے کا پاؤں پھسلا اور وہ ہاتھی پر جا بیٹھا۔ یہ دیکھ کر تینوں چوہے پُرجوش لہجے میں بولے: کچل ڈالو...... کچل ڈالو...... اس نے بھی ہمارے بہت سے ساتھی کچلے ہیں۔
(محمد طاہر، سیال کوٹ)

ایک شخص کو رات کے بارہ بجے ایک کتے نے کاٹ لیا۔ وہ ایک ڈاکٹر کے کلینک پہنچا اور دروازے پر دستک دی۔ جب ڈاکٹر نے دروازہ کھولا تو اس نے کہا: "ڈاکٹر صاحب! مجھے کتے نے کاٹ لیا ہے۔" "اوہ! شاید آپ کو معلوم نہیں کہ میرے کلینک کا وقت 4 بجے سے 8 بجے تک ہے۔" ڈاکٹر نے غصے سے کہا۔
"مجھے تو معلوم ہے جناب!" وہ شخص کراہتے ہوئے بولا۔ "مگر کتے کو معلوم نہیں تھا۔"
(عروسہ علی، ملتان)

ایک ڈراما نگار کا ڈراما اسٹیج پر ہوا تو اس نے جارج برنارڈ شاء کو بھی ڈراما دیکھنے کی دعوت دی۔ ڈرامے کے دوران سارا وقت برنارڈ شاء سویا رہا۔ جب ڈراما ختم ہوا تو ڈراما نگار نے خفگی سے کہا: "میں ڈرامے کے بارے میں آپ کی رائے جاننے کا متمنی تھا مگر آپ تو سارا وقت سوتے ہی رہے۔"
برنارڈ شاء نے بڑے سکون سے جواب دیا: "سونا بھی تو ایک طرح کی رائے ہی ہے۔"
(سلیم اختر، ملتان)

ندیم: تم ایک ساتھ دو روٹیاں کیوں کھا رہے ہو؟
شکیل: ڈاکٹر نے ڈبل روٹی کھانے کو کہا تھا۔
(تحریم علی، لاہور)

رحیم: میں نے کل ایک ایسا بچہ دیکھا جو ہتھنی کا دودھ پی رہا تھا۔
اسلم: وہ کس کا بچہ تھا؟
رحیم: ہتھنی کا۔
(ام کلثوم، کراچی)

باپ: (ناراض ہو کر) میں نے سنا ہے کہ تم آج اسکول جانے کی بجائے کرکٹ کھیلنے گئے تھے؟
بیٹا: نہیں تو......!
باپ: ثبوت......؟
بیٹا: دیکھ لیجیے، میری مچھلیاں پکڑنے والی ڈوری ابھی تک گیلی ہے۔
(نازیہ بٹ، لاہور)

نوید: بھئی حمید! جس مکان میں تم رہتے ہو اس کی تو بنیادیں گلی ہوئی ہیں۔
حمید: کوئی بات نہیں ہم تو اوپر والی منزل میں رہتے ہیں۔
(نجمہ حمید، سرگودھا)

میری زندگی کے مقاصد

سلمان طاہر، راہوالی
میں بڑا ہو کر ڈاکٹر بنوں گا اور عوام کا مفت علاج کروں گا۔

حسنین رضا، کراچی
میں ڈاکٹر بن کر ضرورت مندوں کا مفت علاج کروں گا۔

عبدالرافع، کراچی
ایک اچھا انسان بن کر دوسروں کی مدد کرنا، حافظِ قرآن اور باعمل عالم بننے کی خواہش ہے۔

سید ابھسام حیدر، راول پنڈی
میں بڑا ہو کر پائلٹ بنوں گا۔

کامران ہمایوں، لاہور
میں انجینئر بن کر ملک و قوم کی خدمت کروں گا اور والدین کا نام روشن کروں گا۔

محمد حنظلہ، نجوال کینٹ
میں بڑا ہو کر انجینئر بنوں گا اور ملک کا نام روشن کروں گا۔

نصر علی قاسم، لاہور
میں ڈاکٹر بن کر ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔

محمد مدثر، گوجرہ
میں انجینئر بن کر ملک کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔

نور الورئی، کراچی
میں پروفیسر بن کر علم کی روشنی پھیلاؤں گی۔

محسن رضا، ملتان
میں بڑا ہو کر ڈاکٹر بنوں گا اور ملک کی خدمت کروں گا۔

لائبہ شہزاد، پشاور
اچھا انسان بن کر ملک و قوم کی خدمت کرنا چاہتی ہوں۔

در شہوار، فیصل آباد
میں بڑی ہو کر ڈاکٹر بنوں گی اور غریبوں کا مفت علاج کروں گی۔

شاہ میر عثمان، بھلوال
میں ایک اچھا انسان بن کر دکھی انسانیت کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔

حسان فاروقی، لاہور
میں بڑا ہو کر فوج میں شامل ہوں گا اور ملک کی حفاظت کروں گا۔

حذیفہ مرتضیٰ، ایبٹ آباد
میں پائلٹ بن کر اپنے ملک کی حفاظت کروں گا۔

محمد احمد ریاض، اوکاڑہ
میری زندگی کا مقصد ایک اچھا اور باعمل مسلمان بننا ہے۔

زیرک متین، لاہور
میں ڈاکٹر بن کر غریبوں کا مفت علاج کروں گا۔

شاہ زیب بٹ، لاہور
میں پائلٹ بن کر ملکی سرحدوں کی حفاظت کروں گا۔

احمد بلال خان، چکوال
میں بڑا ہو کر ڈاکٹر بنوں گا اور ملک و قوم کا نام روشن کروں گا۔

تحسیف الرحمٰن، ٹیکسلا کینٹ
میں بڑا ہو کر فوج میں جاؤں گا اور شہادت کا عظیم رتبہ حاصل کروں گا۔

حیدر فاروق، گوجرانوالہ
میں پاک فوج میں شامل ہو کر ملکی سرحدوں کی حفاظت کروں گا۔

ایمان فاطمہ، راول پنڈی
میں ڈاکٹر بن کر ملک و قوم اور انسانیت کی خدمت کروں گی۔

سمیعہ شیخ، لاہور
میں بڑی ہو کر آرٹسٹ بنوں گی اور ملک کو خوب صورت بناؤں گی۔

آریز احمد لودھی، خیر پور
میں بڑا ہو کر پائلٹ بنوں گا اور پاکستان کی سرحدوں کی حفاظت کروں گا۔

عدینہ خان، اسلام آباد
میں اپنے والدین کی خدمت کروں گی اور ملک و قوم کا نام بھی روشن کروں گی۔

سندھ مدرسۃ الاسلام

بانی پاکستان حضرت قائداعظم محمد علی جناح 25 دسمبر 1876ء کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد پونجا جناح نے آپ کو تعلیم کی غرض سے سندھ مدرسۃ الاسلام میں داخلہ دلوایا۔ اس مدرسہ کے قیام کا اعلان سندھ سے مفکر خان بہادر حسن علی آفندی نے یکم

ستمبر 1885ء کو کیا۔ آپ پاکستان کے سابق صدر آصف علی زرداری کے نانا تھے۔ وائسرائے ہند نے 14 نومبر 1887ء کو اس مدرسے کا سنگِ بنیاد رکھا۔ ان کا نام لارڈ "Dufferin" تھا۔ قائداعظم اس اسکول میں 1887ء سے 1892ء تک زیرِ تعلیم رہے۔ سر شاہنواز بھٹو، سر غلام حسین، ہدایت اللہ، حاجی سر عبداللہ ہارون، ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتا اور علامہ آئی آئی قاضی بھی اس اسکول میں زیرِ تعلیم رہے۔ 21 جون 1943ء کو اسے کالج کا درجہ دے دیا گیا۔ سندھ اسمبلی نے 22 دسمبر 2011ء میں اس مدرسہ کو یونی ورسٹی کا درجہ دے دیا۔ چنانچہ 12 فروری 2012ء سے یہاں یونی ورسٹی کلاسز شروع ہوئیں۔ یونی ورسٹی کے پہلے چانسلر ڈاکٹر عشرت العباد خاں اور پہلے وائس چانسلر ڈاکٹر محمد علی شیخ ہیں۔

برطانوی پرچم

انگلینڈ (برطانیہ) کے قومی پرچم کو یونین جیک "Union Jack" یا یونین فلیگ کہتے ہیں۔ اس پرچم کو یونین جیک کا نام کنگ چارلس نے 1634ء میں دیا۔ پرچم کئی تبدیلیوں سے گزر کر یکم جنوری 1801ء کو موجودہ شکل میں سامنے آیا۔ برطانوی پرچم کو اسکاٹ لینڈ کے حکمران James IV کے دور میں مکمل کیا گیا تھا۔ اس دور میں برطانیہ اور اسکاٹ لینڈ اکٹھے تھے۔ برطانوی پرچم پر سرخ کراس سینٹ جارج جب کہ سفید دھاریاں سینٹ اینڈریو

(Saint Andrew) کراس کہلاتی ہیں۔ 2007ء تک برطانوی پرچم صرف شاہی محل اور سرکاری عمارتوں پر لہرانے کی اجازت تھی لیکن سیکرٹری انصاف جیک اسٹرا کی کاوش پر وزیراعظم گولڈن براؤن نے لندن کی 10 ڈاؤننگ اسٹریٹ پر پرچم لہرانے کا بل پاس کر دیا ہے۔ چنانچہ 3 جولائی 2007ء سے یہ جھنڈا اب سڑک پر بھی لگایا گیا ہے۔

نانگا پربت

نانگا پربت (Nanga Parbat) دُنیا کی 9 ویں بلند ترین پہاڑی چوٹی ہے۔ کے ٹو کے بعد اس پہاڑی کو بھی سردی میں سر کرنا اب تک ناممکن ہے۔ سلسلہ ہمالیہ میں شامل یہ چوٹی دُنیا کے خطرناک پہاڑوں میں شامل ہے جو دریائے سندھ کے جنوب میں گلگت بلتستان کے علاقے میں ہے۔ اس پہاڑ کو موت کا پہاڑ یا

"Killer Mountain" کہا جاتا ہے۔ اس کو سر کرنے کی کوشش میں درجنوں کوہ پیما ہلاک ہو چکے ہیں۔ اس پہاڑ کی سطح سمندر سے بلندی 8126 میٹر (26660 فٹ) ہے۔ 1895ء میں "Albert F.Mummery" نے پہلی بار 23000 فٹ طے کیا لیکن متعدد کوہ پیما مر گئے۔ مشرقی سمت سے یہ چوٹی پہلی بار 3 جولائی 1953ء میں آسٹریا کے کوہ پیما کی ٹیم نے سر کی۔ ٹیم کی قیادت "Hermann Buhl" نے کی تھی۔ دیا میر کی طرف سے 1962ء میں جرمن کوہ پیما "Toni Kinshofer" کی ٹیم نے یہ چوٹی سر کی۔ واپسی پر اس ٹیم کے لوگ بھی حادثے کا شکار ہو گئے تھے۔ 1970ء میں اس چوٹی کو سر کرنے کی کوشش میں متعدد کوہ پیما جان کی بازی ہار گئے تھے۔ ان کی یاد میں "Joseph Vilsmaier" نے ایک فلم بنائی جس کا نام "نانگا پربت" تھا۔

سورج مکھی

سورج مکھی کو سن فلاور (Sun Flower) بھی کہتے ہیں۔ اس کا تعلق "Asteraceae" خاندان سے ہے۔ اس کا سائنسی نام "Helianthus Annuus" ہے۔ یہ امریکہ کا مقامی پودا ہے جسے دُنیا بھر میں تجارتی اور زیبائشی طور پر اگایا جاتا ہے۔ اس پودے کا تنا سفید ریشے پیدا کرتا ہے جب کہ پھول دیکھنے میں سورج کی مانند ہے۔ جوانی میں یہ پھول ہارمونز کی وجہ سے سورج

کی سمت اگتا ہے۔ پھول ایک تھالی نما ساخت پہ لگتے ہیں جسے Head کہتے ہیں۔ تھالی کو نمایاں کرنے والا پھول "Ray Flower" جب کہ تھالی کے درمیان میں سیاہ مائل پھول "Disc Floret" کہلاتے ہیں۔ پودے کی اونچائی 1.5 سے 3.5 میٹر (5 سے 12 فٹ) ہوتی ہے۔ جرمنی میں 2009ء میں ایسا سورج مکھی کا پودا پایا گیا جس کی اونچائی 8 میٹر تھی۔ یہ ورلڈ ریکارڈ ہے۔ سورج مکھی کا بیج سیاہ رنگ کا ہوتا ہے جسے 45 سینٹی میٹر (1.5 فٹ) کے فاصلے پر 2.5 سینٹی میٹر (ایک انچ) گہرائی میں لگاتے ہیں۔ سورج مکھی کے بیجوں سے کوکنگ آئل حاصل ہوتا ہے۔ مارجرین مکھن، بائیو ڈیزل، پرندوں کی خوراک، رنگ (Dyes) و پینٹ، ادویات وغیرہ کی تیاری میں سورج مکھی استعمال ہوتا ہے۔ اس کو سب سے پہلے 5000 قبل مسیح میں کاشت کیا گیا۔ یہ یوکرائن (Ukraine) کا قومی پھول ہے۔ اہلِ یورپ سورج مکھی کے پھول کو طویل العمری (Longevity) کی علامت سمجھتے ہیں۔

سائنس کارنر

پرندوں کے پَر کیوں ہوتے ہیں؟

پَر، پرندوں کے لیے ایک ایسا ہلکا پھلکا لباس بناتے ہیں جو ان کو گرم رکھنے کے علاوہ اڑنے میں بھی مدد دیتا ہے۔ پَر وزن میں ہلکے اور تھوڑے سے مڑے ہوتے ہیں۔ جب ان پر نیچے سے ہوا کا دباؤ پڑتا ہے تو پرندہ اڑنے لگتا ہے۔

مرغا صبح کو بانگ کیوں دیتا ہے؟

مرغا صبح ہی صبح بانگ دے کر یہ بتاتا ہے کہ میں دڑبے کا سب سے طاقت ور''مرد'' ہوں۔ مجھ سے ذرا ہوشیار رہنا!

بطخوں کے پنجے جھلی دار کیوں ہوتے ہیں؟

بطخوں کے پنجے میں جھلیاں لگی ہوتی ہیں۔ ان کے جھلی دار پنجے، کشتی کے چپو کی طرح، انہیں پانی میں تیراتے ہیں۔

زیادہ تر پرندوں کے بچے موسم بہار میں کیوں پیدا ہوتے ہیں؟

موسم بہار کے آتے ہی گرمی بھی بڑھ جاتی ہے۔ ہری بھری گھاس، پھول اور پودے ہر طرف نظر آتے ہیں۔ اس ہلکی پھلکی گرمی میں پرندوں کے ننھے ننھے بچوں کے زندہ رہنے کے امکانات زیادہ بہتر ہوتے ہیں۔ اسی لیے زیادہ تر پرندوں کے بچے موسم بہار میں پیدا ہوتے ہیں۔

کچھ پھل موسم خزاں میں کیوں پکتے ہیں؟

کئی پھل، گرمیوں کا پورا موسم گزار کر، خزاں کے موسم میں پکتے ہیں کیوں کہ ان کو زیادہ دھوپ کی ضرورت ہوتی ہے۔ کئی ملکوں میں کچھ پھل ایک سال میں پک کر تیار ہوتے ہیں کیوں کہ یہاں موسمِ خزاں نہیں ہوتا۔

کچھ پھول رات کے وقت اپنی پنکھڑیاں کیوں بند کر لیتے ہیں؟

کچھ پھول رات کے وقت اپنی پنکھڑیاں (پتیاں) بند کر لیتے ہیں تا کہ رات کی ٹھنڈی ہوا اور جانوروں سے اپنی حفاظت کر سکیں۔ یہ پھول صبح ہوتے ہی دوبارہ کھل جاتے ہیں۔

سرد علاقوں کے پرندے، موسم سرما میں گرم علاقوں میں کیوں چلے جاتے ہیں؟

کئی ملکوں میں موسم سرما میں سخت سردی اور برف پڑتی ہے اور پرندوں کو خوراک نہیں ملتی۔ اس لیے ان ملکوں کے پرندے ان علاقوں کا رُخ کرتے ہیں جہاں زیادہ خوراک اور گرمی ہو۔

سردیوں میں درخت خالی خالی کیوں نظر آتے ہیں؟

کئی پہاڑی علاقوں میں خوب برف پڑتی ہے۔ یہاں سردیوں میں برف اور تیز ہواؤں سے پتوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ اس موسم میں مفید کیمیائی مادے پتوں سے واپس تنے میں لوٹ آتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں پتے گرنا شروع ہو جاتے ہیں اور درخت خالی ہو جاتا ہے۔

کچھ جانور سردیوں میں سوتے کیوں رہتے ہیں؟

کچھ جانور ساری سردیاں سوتے رہتے ہیں تا کہ وہ سخت سردی سے بچ جائیں۔ یہ جانور سردیاں آنے سے پہلے اپنے جسم میں بہت سی چربی جمع کر لیتے ہیں اور اس چربی کو خوراک کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

کیکڑے ترچھے رُخ کیوں چلتے ہیں؟

کیکڑوں کی آٹھ لمبی لمبی ٹانگیں ہوتی ہیں۔ یہ ٹانگیں ایک دوسرے میں الجھ نہ جائیں اس لیے کیکڑے ترچھے رُخ چلتے ہیں۔ ان کی اگلی ٹانگیں کھینچنے والی اور پچھلی دھکیلنے والی ہوتی ہیں۔

ویل پانی کا فوارہ کیوں چھوڑتی ہے؟

مچھلیاں پانی میں سانس لیتی ہیں لیکن ویل کو سانس کے لیے بار بار پانی کی سطح پر آنا پڑتا ہے۔ وہ پانی میں غوطہ لگانے سے پہلے اپنے پھیپھڑوں میں بہت سی ہوا بھر لیتی ہیں۔ جب وہ پانی کی سطح پر آ کر سانس باہر نکالتی ہے تو اس کے نتھنوں سے گرم مرطوب ہوا زور سے باہر نکلتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا جیسے پانی کا فوارہ پھوٹ رہا ہو۔

پانچ بہادر

پانچ بہادر گھر سے نکلے کرنے چلے شکار
انجانے میں کر بیٹھے وہ اک چھتے پہ وار
مکھیوں نے جب ہلا بولا پڑی وہ چیخ و پکار
ایک بہادر کھا گئیں مکھیاں باقی رہ گئے چار

چاروں نے اسکیم بنائی چلو چلیں اب چین
وہاں بجائیں سکھ اور دُکھ کی سارے مل کر بین
بین بجا کر پیٹ بھریں گے گزرے گی رنگین
ایک بہادر ہو گیا بزدل باقی رہ گئے تین

تینوں نے یہ مل کر سوچا اب سر کو جوڑو
دو ساتھی بچھڑے بھیا باقی کی سوچو
سب کو پھر یہ بات سمجھائی اپنے گھر لوٹو
ایک بہادر رُک گیا ''پکنک'' باقی رہ گئے دو

دو بہادر آ گئے واپس دونوں ہی تھے نیک
لائے پھر بازار سے جا کر وہ بی پی کا کیک
بھوک لگی تو کھا گیا سارا کیک بہادر
ایک نے چھپ کر کی غداری باقی رہ گیا ایک

ایک بہادر بچا جو باقی بڑا تھا وہ چالاک
چاروں کے غم میں وہ لیکن بڑا ہوا غم ناک
نکل گیا جنگل کی جانب کر کے دامن چاک
ایک بھالو نے کر دیا کھا کر اس کا قصہ پاک

افضال عاجز

یہ قیام پاکستان سے تیس سال قبل کی بات ہے۔ 14 اگست 1917ء کو امرتسر میں ایک بچے نے آنکھ کھولی۔ ماں باپ نے بڑے پیار سے اس کا نام ''عبدالکریم'' رکھا۔ ہوش سنبھالنے پر تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا، مگر حالات موافق نہ رہے۔ مجبوراً میٹرک کے بعد تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا۔

علم کا شوق دل میں مچل رہا تھا، اس لیے اچھی کتابوں کے مطالعے کا عمل مستقل جاری رکھا۔ اس دوران ہر قابلِ ذکر کتاب پڑھی۔ اس سے علم میں اضافہ ہوا اور زندگی سے لڑنے کا حوصلہ پیدا ہوا۔ یہ سچ ہے کہ اچھی کتابیں ہمیشہ زندگی کا شعور دے کر جینے کا ڈھنگ سکھاتی ہیں۔

علم کے اس متوالے کو آج ہم ''آغا شورش کاشمیری'' کے نام سے جانتے ہیں۔ قلم سے ان کا رشتہ نوجوانی میں قائم ہو چکا تھا۔ یہ وہ دور تھا کہ ہندوستان اور پاکستان ابھی اپنی آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے۔ برصغیر کے مسلمان قائداعظم محمد علی جناح کی سربراہی میں آزادی کی جانب سفر کر رہے تھے اور منزل دن بہ دن قریب سے قریب تر ہو رہی تھی۔

شورش کاشمیری ایک سچے مسلمان تھے اور ہر مسلمان کی طرح ان کا خواب بھی ''آزاد پاکستان'' تھا۔ وہ اس کے راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو دور کرنے کا عزم رکھتے تھے۔ اس لیے اس سفر کے دوران انہوں نے تحریر اور تقریر کا بھرپور سہارا لیا۔ حکمرانوں کی نظر میں ان کی یہ کوشش باغیانہ قرار پائیں۔ اس لیے سزا بھی ان کے لیے لازم ٹھہری۔ پہلی بار مسجد شہید گنج کی تحریک میں حصہ لینے پر اڑھائی سال قید کی سزا انہیں ملی۔

لاہور میں واقع مسجد شہید گنج کو 1653ء میں عبداللہ خان نے تعمیر کرایا تھا۔ 9 جولائی 1935ء کو سکھوں نے ماسٹر تارا سنگھ کی قیادت میں اس کو شہید کر دیا۔ اس واقعے نے مسلمانوں کے جذبات کو بھڑکایا جس کے بعد ایک نہ ختم ہونے والے مظاہرے، احتجاجات اور ہنگامے شروع ہو گئے۔ اس کے نتیجے میں کئی مسلمان شہید اور زخمی بھی ہوئے۔ بالآخر مسلمان اس مسجد کو دوبارہ حاصل کر کے تعمیر کرنے میں کام یاب ہو گئے۔

شورش کاشمیری کو دوسری بار دو سال اور تیسری بار ڈیڑھ سال کی سزا ملی۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران ایک اور باغیانہ تقریر کے الزام میں ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت گرفتار ہوئے۔ اس بار سات سال کی قید ان کا مقدر ٹھہری۔ وہ سیاست کے ساتھ ساتھ

صحافت کے میدان کو بھی خود کے لیے منتخب کر چکے تھے۔

14 اگست 1947ء کو آزادی کا اعلان برصغیر کے کروڑوں مسلمانوں کے لیے خوشی کا پیغام لے کر آیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد وہ مولانا ظفر علی خان کے مشہور اخبار ''زمیندار'' سے منسلک ہو گئے۔ اس کے بعد علامہ تاجور نجیب آبادی کے شاہکار اُردو روزنامہ ''آزاد'' کی ادارت کے فرائض انجام دیے۔ کچھ عرصہ حافظ علی بہادر کے اخبار ''الہلال (بمبئی)'' کا افتتاحیہ لاہور سے لکھ کر بھیجتے رہے۔

یکم جنوری 1949ء کو اپنا ہفت روزہ ''چٹان'' جاری کیا۔ اس موقع پر سردار عبدالرب نشتر نے یہ تاریخی جملہ کہا: ''زندگی بھر چٹانوں سے ٹکرانے والا بالآخر چٹان کی پناہ لینے پر مجبور ہوگیا۔''

شورش کاشمیری نے چٹان کے پہلے شمارے کے افتتاحیہ میں لکھا: ''چٹان افادی ادب کی بے لوث آواز ہے اور تعمیری سیاست کی بے خوف صدا ہے۔ میں نے اس کے مضامین کو اپنے لہو کی ایک ایک بوند سے رنگین بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔''

آغا شورش کاشمیری سیاست کے ساتھ ساتھ خطابت، صحافت، انشاء پردازی، طنز و مزاح، خطوط نویسی، سوانح نگاری اور شاعری جیسے کئی اصناف پر ان کا کیا ہوا کام آج بھی طالب علموں کی علمی پیاس بجھاتا ہے۔

مشہور نقاد رشید احمد صدیقی کا دعویٰ ہے: ''گزشتہ پچاس سال میں اتنی خوب صورت نثر لکھنے والا اُردو زبان میں پیدا نہیں ہوا۔''

چٹان کے بیش تر مضامین شورش کاشمیری کے نوکِ قلم سے نکلتے تھے۔ ان میں کچھ تو وہ اپنے معروف قلمی نام ''شورش کاشمیری'' کے نام سے لکھتے تھے اور بقایا اسرار بصری کے نام سے۔ چٹان کا لہجہ خاصا تیز ہوتا تھا، جس کی وجہ سے یہ تیس بار بندش کا شکار ہوا، اور تقریباً بیس بار انہیں گرفتاری جیسے عمل سے گزرنا پڑا۔ انہیں مولانا ابوالکلام آزاد اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری جیسے بڑے لوگوں نے کام یابی کی دُعا دی تھی۔

انہوں نے تحریکِ ختم نبوت میں بھی بھرپور حصہ لیا۔ وہ اپنے رسالے ''چٹان'' میں قادیانیوں کے خلاف خوب لکھا کرتے تھے۔ حکومت کی جانب سے تنبیہ کی گئی تو ان کا جواب تھا: ''مرنے کے بعد میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کس منہ سے پیش ہوں گا کہ ان کی غلامی کا دعویٰ کرنے کے باوجود ختم نبوت کا جھنڈا بھی نہ اٹھا سکا۔'' یہ کہتے ہوئے ان کے آنسو جاری ہو گئے۔

25 اکتوبر 1975ء کو وہ اپنے ابدی سفر پر روانہ ہو گئے۔ ان کی وفات کے بعد چٹان کی ادارت ان کے بیٹے مسعود شورش نے سنبھالی۔

تصنیف و تالیف کے میدان میں آغا شورش کاشمیری کی یادگاروں میں مجموعہ کلام ''گفتنی نا گفتنی'' اور ''چہ قلندرانہ گفتم'' کے علاوہ نثر میں ''اُس بازار میں، موت سے واپسی، پسِ دیوارِ زنداں، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، ظفر علی خان اور میاں افتخار الدین کی سوانح عمری کے علاوہ ان کی نامکمل آپ بیتی بھی شامل ہے۔

ان کی خدمات کے اعتراف میں لاہور میں ایک سڑک ان کے نام سے منسوب کی گئی ہے۔ ☆☆

حیاتِ فاروق اعظمؓ ایک نظر میں

☆22 لاکھ مربع میل پر اسلامی خلافت کا قیام☆ 36 ہزار علاقے فتح ہوئے ☆ قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کا خاتمہ ہوگیا☆ عراق و ایران فتح ہوئے☆ روم اور ترکستان خلافت اسلامی میں شامل ہوئے ☆ دمشق اور بعلبک کے علاقے فتح ہوئے ☆ شرق اردن، یرموک اور قادسیہ کی عظیم الشان فتوحات ہوئیں ☆ اہواز، مدائن، انطاکیہ اور حلب فتح ہوئے ☆ قبلہ اوّل بیت المقدس آزاد ہوا☆ تقریباً ایک تہائی دُنیا پر اسلامی پرچم لہرایا☆9004 مساجد کی تعمیر☆ شہر کوفہ کی بنیاد رکھی۔

آپؓ کے زہد و تقویٰ کی یہ حالت تھی کہ بیت المال میں سے اپنا وظیفہ سب سے کم مقرر کیا جو آپؓ کی ضرورت کے لیے بہت کم تھا اور کئی مرتبہ بیت المال سے صرف دو ہی جوڑے کپڑے کے لیتے، وہ بھی کسی موٹے اور کھردرے کپڑے کے ہوتے۔ جب وہ پھٹ جاتے تو ان پر چمڑے اور ٹاٹ کے پیوند لگاتے۔ حضرت زید بن ثابتؓ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کے لباس میں سترہ پیوند شمار کیے۔

آپؓ میں خشیت اور خوفِ الٰہی کی یہ حالت تھی کہ نماز میں ''آیت قیامت و آخرت'' کے ذکر پر آبدیدہ ہو جاتے...... زکوٰۃ و صدقات بہت کثرت سے دیا کرتے تھے...... آخر عمر میں ہمیشہ روزے سے رہتے تھے، سوائے ''ایام ممنوع'' کے۔ اپنی رعایا کی خبر گیری کے لیے راتوں کو اٹھ کر گشت کیا کرتے...... جو صحابہ کرامؓ جہاد پر گئے ہوتے ان کے گھروں کی ضروریات کا خیال رکھتے، بازار سے سامان وغیرہ خود خریدتے اور ان کے گھروں میں پہنچاتے تھے۔

☆......☆......☆

آئیے عہد کریں!

دادا جان اپنے بڑے بیٹے ریاست علی سے ملنے آئے تھے۔ ان کے دو پوتے فائق اور تیمور تھے۔ فائق بڑا تھا اور تیمور ابھی بہت چھوٹا تھا۔ فائق بہت شرارتی لڑکا تھا۔ وہ دوسروں کو تنگ کر کے بہت خوش ہوتا تھا۔ چھوٹے بچوں کو چھیڑنا اور چپت لگانا اس کی عادت تھی۔ ننھا تیمور اس کی شرارتوں سے ہر وقت روتا رہتا تھا۔ گھر میں خوب شور ہوتا، پتا چلتا کہ فائق گھر میں موجود ہے اور شرارتیں کرنے میں مشغول ہے۔ بچے فائق کو پسند نہیں کرتے تھے اور اس سے سخت عاجز تھے۔ ایک دن فائق نے ننھے تیمور کو تھپڑ مار دیا اور اس کے ہاتھ سے چاکلیٹ چھین لی۔ دادا جان یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے فائق کو بلایا اور اسے پیار سے سمجھایا کہ اپنے سے چھوٹے بچوں سے پیار اور شفقت سے پیش آنا چاہیے۔ ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم بچوں کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے اور انہیں پیار کرتے تھے۔ کبھی بچوں کو گود میں بٹھا لیتے اور انہیں کھلاتے پلاتے تھے، حتیٰ کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم بچوں کے قریب سے گزرتے تو ان کو خود السلام علیکم کہتے تھے۔ بیٹے! تم بھی بچوں سے شفقت سے پیش آیا کرو۔ ہم پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ وسلم کے ماننے والے ہیں، لہٰذا ہمیں پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر بھی عمل کرنا چاہیے۔ پیارے بچو! آپ بھی عہد کریں کہ اپنے سے چھوٹے بچوں کے ساتھ شفقت سے پیش آئیں گے۔

شاباش

ان بچوں نے پچھلے شمارے میں عہد کیا ہے کہ وہ بغیر اجازت کسی کی چیز استعمال نہیں کریں گے اور چیز دینے والے کا شکریہ بھی ادا کریں گے۔

مدنی عابد، ملتان۔ محمد زین عظمت، گوجرانوالہ۔ ثناء رانی، گجرات۔ ماہ نور ارشد، گوجرہ۔ ملیحہ شہباز، بورے والا۔ بلال احمد، میاں والی۔ صفا رشید، کراچی۔ فیضان بدر، بورے والا۔ امیز فاطمہ، گوجرانوالہ۔ محمد حسان رضا خان، واہ کینٹ۔ محمد عمیس، کلورکوٹ، بھکر۔ محمد کامران قادری، حسن ابدال۔ عائشہ ندیم، مردان۔ محمد اسامہ وحید، ہری پور۔ اسامہ بن طاہر، ہریا اسٹیشن۔ نوال فاطمہ، اسلام آباد۔ عائشہ کریم، ملتان۔ سید اعتصام حیدر، راول پنڈی۔ درِ مکنون، گجرات۔ محمد حبیب اللہ، لاہور۔ عائشہ منیبہ امجد، شام کوٹ۔ مدحت حامد، واہ کینٹ۔ حمد اللہ، شمشاد آباد۔ محمد شاہ زیب اظہر، اسلام آباد۔ محمد عثمان حسین، راول پنڈی۔ اریبہ صابر، لاہور۔ عارفہ شیخ، بہار کالونی، کوٹڑی۔ محمد مجیر خان، بھکر۔ کلثوم طارق، راول پنڈی۔ محمد احمد خان غوری، بہاول پور۔ اسد علی انصاری، ملتان۔ فرحین علی خان، صوابی۔ عکس عائشہ، ملتان۔ عامر سہیل، بھکر۔ رانا بلال احمد، قاضیانوالہ۔ عرفان خان، جہلم۔ ارمغان امین، لاہور۔ حمزہ اظہر، لاہور۔ صباحت تنویر، مہمند کالونی۔ سید حسن عسکری شاہ، جھنگ۔ آمنہ ارشد، ٹیکسلا۔ مہد نسیم، ایبٹ آباد۔

اب یہ کوئی سچ مچ کا بیاہ تو تھا نہیں کہ اس میں سارے محلے اور کنبے ٹبر کی ٹھاٹ دار دعوت ہوتی، باجا گاجا بھی ہوتا اور مراثیوں کا ناچ بھی۔ ایک گڑیا کا بیاہ تھا اور گڑیا بھی کیسی کہ جس نگوڑی کے سر دوپٹا نہ تن پر چیتھڑا لیکن بھیا سعید سر تھے کہ بھئی بیاہ ہو تو ایسا ہو کہ سو دیکھیں تو نو سو تعریف کریں۔ اگر پورے کنبے ٹبر کی دعوت نہ ہو تو کم سے کم محلے والے تو ضرور ہی شریک ہوں۔ رہے ان کے دوست، تو اوّل تو وہ ہیں ہی کتنے، پھر اتنے بندوں میں دو چار اَیرے غیرے بھی کھپ ہی جاتے ہیں۔

امی جان بولیں۔ ”بھئی دولہا والیوں سے بھی پوچھ لو۔ دیکھو وہ کیا صلاح دیتی ہیں۔“

راتوں رات نائن کے ہاتھ تسنیم کو بلایا اور اس سے مشورہ کیا تو وہ بولی۔ ”بہن، مہنگائی کا زمانہ ہے۔ اگر آج کسی سے قرض ادھار لے کر ذات برادری میں واہ واہ کروا بھی لی تو کل اس کا انجام بُرا ہو گا۔ اس لیے میری مانو، دو چار لڑکیوں کو بلا لو۔ دو چار کو میں بلا لوں گی۔“

امی جان ہماری باتیں غور سے سن رہی تھیں۔ ہمیں بڑی بوڑھیوں کی طرح باتیں کرتے دیکھ کر ہنس پڑیں اور ہاتھ ہلا کر بولیں۔ ”اے لو! تم خرچ کی پروا مت کرو۔ محلے کی لڑکیاں تو آئیں گی ہی، اسکول کی لڑکیوں کو بھی بلا لینا۔“

بھیا سعید بھنا کر بولے۔ ”جی ہاں، ان کی تو سب چڑیلیں آئیں گی اور ہمارا ایک دوست بھی نہیں۔“

تسنیم ہنس کر بولی۔ ”اچھا بھئی، تم بھی دو چار بھوت بلا لینا۔“

”ارے بھئی لڑو مت!“ امی جان صلح کراتے ہوئے بولیں۔ ”سعید کے دوست آئیں گے تو تمہارا ہی فائدہ ہو گا۔“

تسنیم ہاتھ نچا کر بولی۔ ”کیا خاک فائدہ ہو گا؟ ہنڈیا تک چاٹ جائیں گے نگوڑ مارے۔“

سعید بھائی چڑ کر بولے۔ ”اور امی جان ان کی چڑیلیں منہ میں کپڑا ٹھونس کر آئیں گی (منہ بسور کر)۔ لو بھئی، ہم نے سوچا تھا ہماری بہن سیما کی گڑیا کا بیاہ ہے۔ اپنے اسکول کا بینڈ لائیں گے مگر......“

بینڈ کا نام سنتے ہی میں پھڑک اٹھی۔ تسنیم مچل گئی اور امی جان جھوم کر بولیں۔ ”بس بھئی، ٹھیک ہے۔ اب کوئی اچھا سا دن مقرر کر لو۔“

میں بولی۔ ''اتوار کا دن ٹھیک ہے۔ چھٹی بھی ہوگی۔''

تسنیم اٹھلا کر بولی۔ ''اچھی بات ہے، بہن! اب میں جاتی ہوں۔ کچھ بندوبست بھی تو کرنا ہے آخر۔''

اتوار کے دن صبح ہی سے ہم تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ دالان میں چٹی چٹی چادروں کا فرش کر کے نہایت قرینے سے گل دان، اگال دان اور خاص دان سجا دیئے۔ امی جان کا تو عجیب حال تھا۔ ایک قدم باورچی خانے میں تو دوسرا دالان میں۔ کبھی ماما کو ہدایت کرتیں۔ ''اے نگوڑی، زردے میں الائچیاں اور زعفران ڈالنا مت بھول جانا۔'' کبھی مجھ سے اور نکہت سے کہتیں۔ ''یہ گاؤ تکیہ اُدھر رکھو۔ ایک خاصدان یہاں بھی ہونا چاہیے۔'' غرض عجب ہما ہمی اور گہما گہمی کا عالم تھا کہ تھوڑی دیر میں مہمان آنے شروع ہوئے۔ جسے دیکھو ہنستا اور کھل کھلاتا چلا آ رہا ہے۔ جب سارا گھر بھر گیا تو امی جان بولیں۔ ''اے، یہ منہ بند کر کے کیوں بیٹھی ہو؟ کچھ ہنسو بولو، گاؤ بجاؤ۔''

امی جان کا یہ کہنا تھا کہ وہ اُودھم مچا کہ خدا کی پناہ۔ ڈھولک پر تھاپ پڑی اور سب نے مل کر آواز نکالی۔

''گوندھ کر لائیو پھولوں کا تو مالن سہرا''

ابھی یہ غل غپاڑا مچ ہی رہا تھا کہ ماما دوڑی ہوئی آئی اور بولی۔ ''بی بی جی، برات آ رہی ہے۔'' سب خاموش ہو گئے اور کپڑے ٹھیک ٹھاک کرنے لگے کہ اتنے میں برات داخل ہوئی۔ آگے آگے سعید بھائی کا بینڈ تھا۔ اس کے پیچھے دولہا میاں اور ان کے پیچھے بچے اور بچیوں کی ایک فوج۔ ایک سمندر تھا خوشی اور مسرت کا جو ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

سب قرینے سے بیٹھ گئے تو سعید بھائی نے جاوید کو کچھ اشارہ کیا۔ وہ اندر کمرے میں چلا گیا اور سعید بھائی بولے۔ ''بھئی، دولہا میاں رات کو روٹی ذرا زیادہ کھا گئے تھے۔ بے چاروں کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ اس لیے نکاح ابھی پڑھا دینا چاہیے۔'' یہ کہہ کر زور سے پکارا:

''اجی قاضی صاحب! اجی قبلہ قاضی صاحب!''

کیا دیکھتے ہیں کہ قاضی صاحب چلے آ رہے ہیں۔ پیروں تک اچکن، سر پر بڑی سی پگڑی، لمبی سی ڈاڑھی اور ناک پر ٹوٹی عینک۔ یہ جاوید تھا۔ جس نے دیکھا ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گیا۔ قاضی صاحب آ کر سب کے بیچ براجمان ہو گئے اور ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر بولے۔ ''اچھا بھئی، سب سے پہلے دلہن کا نام بتاؤ۔''

میں نے کہا۔ ''دلہن کا نام پھلجڑی بیگم۔''

بھیا سعید بولے۔ ''دولہا کا نام شیخ لٹو بخش۔''

قاضی صاحب بولے۔ ''سبحان اللہ! کیا جناتی نام ہے۔ خیر، اب نکاح شروع ہوتا ہے۔'' یہ کہہ کر آپ دولہا سے بولے۔

املی کے پتے ببول کے پھول
کہو میاں گڈے، گڑیا قبول

اب کوئی سچ مچ کا دولہا ہوتا تو ''ہاں'' کہتا بھی۔ میاں گڈے کیا کہتے خاک؟ اس لیے سعید بھائی بولے۔ ''قبول۔''

قاضی صاحب بولے۔ ''استغفر اللہ! اماں نکاح آپ کا ہو رہا ہے یا شیخ لٹو بخش کا؟ جب تک دولہا ہاں نہ کہے گا، نکاح ہرگز نہ ہو گا۔ یہ شریعت کا معاملہ ہے بچوں کا کھیل نہیں۔''

اب تو ہم لوگ بڑے پریشان ہوئے۔ آخر بڑی دقت سے قبلہ قاضی صاحب کو ایک چونی دے کر راضی کیا اور نکاح بخیر و خوبی ختم ہوا۔

شام کو سب مہمانوں نے مل جل کر کھانا کھایا اور پھر برات رخصت ہونا شروع ہوئی۔ ہائے میری پیاری گڑیا! ہمیشہ کے لیے مجھ سے جدا ہو رہی ہے۔ کتنے چاؤ سے بنوائی تھی میں نے۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پلٹ کر امی جان کو دیکھا تو وہ بھی دوپٹے سے آنکھیں پونچھ رہی تھیں۔ میں حیرت سے بولی۔ ''ارے امی جان! آپ بھی...... آپ رو رہی ہیں؟''

میرے سر پر ہاتھ پھیر کر بولیں۔ ''نہیں بیٹی، یوں ہی آنکھ میں کچھ پڑ گیا تھا۔ تم برات کے ساتھ نہیں گئیں؟''

میں ٹھنک کر بولی۔ ''تسنیم کہتی تھی دلہن کے ساتھ دلہن والے نہیں جایا کرتے۔''

ہنس کر بولیں۔ ''چل چڑیل۔ ارے سعید بیٹا، سیما کو تسنیم کے گھر پہنچا آؤ۔''

☆☆

مختصر مختصر

نصیحت

ماں کی جس نے کی ہے خدمت
اس کو مل کے رہی ہے جنت
جس نے باپ کو رکھا راضی
اس سے رہا ہے اللہ راضی
رکھو خوش ماں باپ کو اپنے
اچھے دن پھر دیکھو اپنے
کہنا استادوں کا تم مانو
اس میں عزت ہے تم جانو
عزت کرنے میں عزت ہے
ورنہ ذلت ہی ذلت ہے
دولت کے مت پیچھے جانا
لالچ میں تم مت آ جانا
جتنی افق اللہ نے لکھ دی
دولت اتنی مل کے رہے گی

(افق دہلوی)

مانو بلی

پیاری پیاری مانو بلی
راج دلاری مانو بلی
مونچھیں لمبی دُم موٹی ہے
دیکھو تو لگتی چھوٹی ہے
اگر چھیڑو تو رو جاتی ہے
صوفے پر ہی سو جاتی ہے
چوہے اس سے سب ڈرتے ہیں
اس کے رعب کا دَم بھرتے ہیں
ملتانی نہ، جاپانی ہے
بلی میری ایرانی ہے
اس کو ہم نہلاتے ہیں
خوش بو خوب لگاتے ہیں
سختی ذرا سی یہ نہ جھیلے
سب بچوں سے مل کر کھیلے

(فاران شاہد، لاہور)

غصے کی حالت

حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی: ''بیٹا! جب تم کسی سے بھائی چارا کرنا چاہو تو پہلے آزمائش کے طور پر اسے غصہ دلاؤ۔ اگر اس نے غصے کی حالت میں بھی انصاف قائم رکھا تو اسے بھائی بنا لو اور اگر ایسا نہ ہو تو اس سے بچو اور سمجھ لو کہ وہ دوستی کے قابل نہیں۔

(نعمان حیدر، لاہور)

نماز کی عظمت

حضرت حسنؓ نے فرمایا کہ نمازی کے لیے تین خصوصی عزتیں ہیں۔
پہلی یہ کہ وہ جب نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو اس کے سر سے آسمان تک رحمت الٰہی گھٹا بن کر چھا جاتی ہے اور اس کے اوپر انوار بارش کی طرح برستے ہیں۔
دوسری یہ کہ فرشتے اس کے چاروں طرف جمع ہو جاتے اور اس کو گھیرے میں لے لیتے ہیں۔
تیسری یہ کہ ایک فرشتہ پکارتا ہے کہ اے نمازی! اگر تو دیکھ لے کہ تیرے سامنے کون ہے اور کس سے بات کر رہا ہے تو خدا کی قسم تو قیامت تک سلام نہ پھیرے۔ (سبحان اللہ)

(محمد سلیم مغل، قصور)

تیرنے والا ریستوران

سویڈن میں ایک انوکھا تیرنے والا ریستوران ''سالٹ اینڈ سل'' واقع ہے جو سویڈن کے جنوب میں بنایا گیا ہے، اس کی تعمیر کا آغاز اکتوبر 2008ء میں ہوا۔ یہ ایک ماحول دوست ریستوران ہے

جس میں لوگ کھلی فضا میں بیٹھ کر ہوٹل کی سہولتوں سے استفادہ کرتے ہیں۔ یہ ہوٹل دو منزلوں پر مشتمل ہے۔ اس ریستوران کے کمروں کو اعلیٰ ترین فرنیچر سے سجایا گیا۔ اس تیرنے والے ریستوران میں مہمانوں کو "Sea Food" سے بنائے گئے کھانوں سے لطف اندوز کروایا جاتا ہے جب کہ ریستوران میں ایک میٹنگ روم اور کانفرنس ہال بھی بنایا گیا ہے۔

(سعد خالد ظفر، قلعہ دیدار سنگھ)

اچھی باتیں، سچی باتیں

آپ انسان سے سب کچھ چھین سکتے ہیں، مگر اس کے جذبے نہیں۔

خاموش رہو یا کوئی ایسی بات کہو جو خاموشی سے بہتر ہو۔

محنت ایک تتلی ہے جو کام یابی کے پھولوں پر بیٹھتی ہے۔

دُنیا میں تمام چیزوں کی حد ہے، سوائے علم کے۔

لوگ اونچے پہاڑوں سے ہی نہیں اکثر کنکریوں سے بھی پھسل جاتے ہیں۔

شر اور فساد کو چھوڑنا بھی صدقہ ہے۔

سمجھ دار وہ ہے جس کا آج، کل سے اچھا ہو۔

(اُشمل افضل، لاہور)

اقوالِ زریں

اگر کوئی شخص گناہ کرے کہ وہ آسمان تک پہنچ جائے پھر توبہ کرے تو اللہ اسے معاف کر دیتا ہے۔

جو شخص نجومی یا کاہن کے پاس جائے اور اس سے کسی چیز کے بارے میں سوال کرے، اس کی چالیس دنوں کی نماز قبول نہیں۔ (مسلم شریف)

جو شخص سلام سے پہلے بات کرے اس کا جواب مت دو جب تک پہلے سلام نہ کرے۔

علم بغیر عمل اور عمل بغیر علم گمراہی ہے۔

بادشاہ کا ایک گھڑی کا عدل سات سال کی عبادت سے زیادہ ہے۔

جھوٹی زبان سب سے بڑی مجرم ہے۔

اخلاص یہ ہے کہ اعمال کا عوض نہ چاہے۔ دنیا کو آخرت کے لیے اور آخرت کو اللہ تعالیٰ کے لیے چھوڑ دو۔

عبادت ایک پیشہ ہے۔ دُکان اس کی خلوت ہے، اعمال اس کا تقویٰ ہے اور نفع اس کی جیت ہے۔

جو اللہ تعالیٰ کے کاموں میں لگ جائے، اللہ تعالیٰ اس کے کاموں میں لگ جاتا ہے۔

زبان کو شکوہ سے روک، خوشی کی زندگی عطا ہو گی۔

(اعجاز احمد، پشاور)

امتحان

دوست کا امتحان مصیبت میں ہوتا ہے۔

بھائی کا امتحان ناراضگی میں ہوتا ہے۔

بیوی کا امتحان غربت میں ہوتا ہے۔

مومن کا امتحان غصے میں ہوتا ہے۔

آنکھ کا امتحان بازار میں ہوتا ہے۔

زبان کا امتحان محفل میں ہوتا ہے۔

دل کا امتحان عشق میں ہوتا ہے۔

ہاتھ کا امتحان انصاف میں ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ہر امتحان میں کام یابی عطا فرمائے۔ (آمین!)

(حافظ محمد فرخ حیات، پیر محل)

اقوالِ زریں

اس چیز کے لیے آنسو مت بہاؤ جو تمہارے لیے نہیں بنی۔

چاہے کچھ بھی ہو مشکل کے وقت گزر جاتے ہیں، اگر نہیں گزرتے تو انسان گزر جاتے ہیں۔

جو شخص اپنے کام کو پسند کرتا ہے اس کی عقل میں فتور آ جاتا ہے۔

خواہش پرستی مہلک رفیق ہے اور بُری عادت زبردست دشمن ہے۔

جو لوگ اونچی جگہ پر کھڑے ہوتے ہیں انہیں گرانے کے لیے تند و تیز ہوائیں چلتی ہیں اور اگر وہ گر پڑیں تو ان کا جسم کرچیوں کی مانند بکھر جاتا ہے۔ (ایمان علی، راول پنڈی)

☆......☆......☆

لالہ رام چند کی بیٹی لاج ونتی کی شادی تھی۔ محلے کے لڑکے بالے شادی کا منڈھا تیار کر کے اسے پھول پتیوں اور بیل بوٹوں سے سجا رہے تھے۔

ہندوؤں میں ''منڈھا'' یا ''منڈپ'' اس شامیانے کو کہتے ہیں، جو براتیوں کو بٹھانے اور شادی کی رسمیں ادا کرنے کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ لڑکے کاغذ کی بیلیں منڈھے پر لگا رہے تھے مگر وہ ہوا سے اُڑ کر نیچے آن گرتی تھیں۔ ایک بیل جو بار بار گر رہی تھی اور لڑکا گھر کی ملازمہ سے بار بار اسے اٹھا کر دینے کو کہتا تھا، اُڑ کر دُور چلی گئی۔ ملازمہ اسے پکڑنے دوڑی اور جب لے کر واپس آئی تو چڑ کر بولی: ''بھیا مجھے تو یہ بیل منڈھے چڑھتی نظر نہیں آتی، اسے رہنے ہی دو!''

لاج ونتی کی دادی کو ملازمہ کی اس بات پر بڑا غصہ آیا، وہ بڑی وہمی طبیعت کی تھیں۔ انہوں نے اس بات سے بُرا شگون نکالا اور ملازمہ کو ڈانٹتے ہوئے بولیں:

''تیرے منہ میں خاک! کیا بکواس کرتی ہے۔ دور ہو جا یہاں سے۔''

اور پھر کچھ ایسا عجیب اتفاق ہوا کہ ان کا وہم سچ ثابت ہو گیا۔ بارات آئی مگر دونوں سمدھیوں کے درمیان جہیز کی وجہ سے تکرار ہو گئی اور دولہا والے ناراض ہو کر بارات واپس لے گئے۔ لڑکی والے روتے پیٹتے رہ گئے۔ لڑکی کی دادی بین کرتی اور کہتی تھی......

''ہائے اس کلموہی کہاری (ملازمہ) نے ہی بُرا شگون منہ سے نکالا۔ میرے دل میں تو اسی وقت سے ہول اُٹھ رہا تھا کہ کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا۔ اسی نے کہا تھا کہ یہ بیل منڈھے چڑھتی نظر نہیں آتی۔''

جب بھی کوئی رشتہ یا شادی ناکام ہونے کا خدشہ ہو تو عورتیں کہتی ہیں کہ یہ بیل منڈھے پر چڑھتی نظر نہیں آتی۔ اس کے علاوہ اگر کسی کام میں کوئی رخنہ یا رکاوٹ معلوم ہو تو لوگ یہی محاورہ دہراتے ہیں۔

مدیر تعلیم و تربیت! السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟

اکتوبر کا شمارہ بہت شان دار تھا، خاص طور پر ناول نیلی روشنی کا راز بہت زبردست ہے۔ میں نے آپ کو تین کہانیاں بھیجی ہیں۔ اکتوبر میں میری بہن کی سال گرہ تھی۔ (ثوبیہ انجم، میر پور آزاد کشمیر)

☆ ثوبیہ انجم نے بہت رنگ برنگ اور خوب صورت خط لکھا ہے۔ پڑھ کر دل بہت خوش ہوا۔ بہن کے لیے بہت سی نیک دعائیں۔ رسالے کی سالانہ ممبر شپ کے لیے سرکولیشن مینیجر کے نام 500 روپے کا منی آرڈر ارسال کریں۔ آپ کی کہانیاں مل گئی ہیں۔

رسالے کے سب سلسلے اچھے جا رہے ہیں۔ میری تجویز ہے کہ سلسلہ میری زندگی کے مقاصد ختم کر دیا جائے۔ رسالے کی قیمت اور صفحات بڑھا دیں۔ کوئی انعامی کہانی شروع کریں جس کا موضوع دیا گیا ہو۔ اس سے بچوں کی تحریری اور ذہنی صلاحیتیں بڑھیں گی۔ (منیب الحسن، اٹک)

منیبہ عارف نے ڈجکوٹ سے بہت پیار بھرا خط لکھا ہے۔ آپ کی پسندیدگی کا بہت شکریہ۔

میں تقریباً ایک سال سے آپ کا رسالہ پڑھ رہی ہوں۔ میں نے کچھ نظمیں اور کہانیاں بھیجی ہیں لیکن کوئی بھی شائع نہیں ہوئیں۔ (نصرت رئیس بٹ، شیخوپورہ)

اسامہ بن طاہر نے ملکوال سے خط لکھا ہے، اور پوچھا ہے کہ ان کی لکھائی کیسی ہے؟

☆ ڈیئر اسامہ لکھائی مزید بہتر کریں اور اپنی تحریریں بھی بھیجیں۔

رسالے کی تمام تحریریں اچھی تھیں۔ مشہور شخصیات کے انٹرویو بھی شائع کیجیے اور ایک صفحہ اشعار کے لیے بھی مخصوص کر دیں۔ (محمد زوہیب بنگش، کوہاٹ)

☆ آپ کی تجویز اچھی ہے اس پر غور کریں گے۔

آپ کا کیا حال ہے؟ میں پہلی بار آپ کی محفل میں شرکت کر رہا ہوں۔ ہر ماہ رسالے کا انتظار رہتا ہے۔ (میاں زین ارشد، گوجرہ)

☆ آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔

نومبر کا شمارہ زبردست تھا۔ سالانہ ممبر بننے کے لیے کیا کرنا پڑے گا؟

☆ سالانہ ممبر بننے کے لیے 500 روپے کا منی آرڈر سرکولیشن مینیجر کے نام ارسال کر دیں۔

یہ میرا پہلا خط ہے۔ اس بار کہانی بھیج رہی ہوں۔ امید ہے کہ آپ میری حوصلہ افزائی کریں گے۔ (ماہ نور ارشد، گوجرہ)

☆ آپ کی کہانیاں پڑھنے کے بعد معیاری ہوئیں تو ضرور شائع کریں گے۔

یہ میرا پہلا خط ہے۔ نومبر کا شمارہ زبردست تھا۔ (عروسہ شہباز، کرک)

☆ پسندیدگی کا بہت بہت شکریہ۔

نومبر کا شمارہ بہت پسند آیا۔ یہ میرا پہلا خط ہے۔ چچا تیز گام بہت یاد آتے ہیں۔ (سید ارشان حسین، واہ کینٹ)

نومبر کا شمارہ بہت زبردست تھا۔ میں رسالے کا نیا قاری ہوں۔ (حمد اللہ خان، طورو مردان)

☆ آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔

نومبر کا شمارہ زبردست تھا۔ تمام کہانیاں دل چسپ اور سبق آموز تھیں۔ (انعم محمد حنیف، کراچی)

نومبر کا شمارہ لاجواب تھا۔ نیلی روشنی کا راز ناول بہت اچھا ہے۔ بدگمانی کا عذاب اور دم والا بچہ اچھی کہانیاں تھیں۔ یہ میرا پہلا خط ہے۔ (امیز فاطمہ، عائشہ فاطمہ، گوجرانوالہ)

پہلی بار خط لکھ رہا ہوں۔ میرے امتحانات تھے اور میں نے دوسری پوزیشن حاصل کی ہے۔ (عمیر عامر، راول پنڈی)

☆ آپ کو مبارک باد قبول ہو۔ اللہ تعالیٰ ہمارے وطن کے نونہالوں کو ہر میدان میں کام یاب کرے۔ (آمین)

میں تین سال سے تعلیم و تربیت کی خاموش قاری ہوں۔ چند تحریریں بھیج رہی ہوں۔ (خدیجہ الکبریٰ، کھڈیاں خاص)

میں سات سال سے تعلیم و تربیت پڑھ رہی ہوں۔ یہ میرا پہلا خط ہے۔ بدگمانی کا عذاب، ماموں وائی فائی، سچی لگن، گم نام مسیحا اور تیس روپے والی مچھلی اچھی کہانیاں تھیں۔ (غاصیقہ صابر)

مجھے تعلیم و تربیت بہت اچھا لگتا ہے۔ میں ہر ماہ شرکت کرتی ہوں لیکن کچھ بھی شائع نہیں ہوتا۔ (ایمن امجد، لاہور)

تمام کہانیاں اپنے عروج پر تھیں۔ گم نام مسیحا، ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے، سچی لگن اور نیلی روشنی کا راز بہت اچھی کہانیاں تھیں۔ اللہ آپ کے ادارے کو دن دوگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔

(شہزادی خدیجہ شفیق، لاہور)

یہ میرا پہلا خط ہے۔ نومبر کے شمارے کی تمام کہانیاں سبق آموز تھیں۔

(سباحت تنویر)

یہ میرا پہلا خط ہے۔ تعلیم و تربیت بے مثال جریدہ ہے۔ اس سے بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔ کیا سلسلہ ''سوال یہ ہے کہ......'' میں عمر کا تعین ہے؟ سلسلہ میری زندگی کے مقاصد ختم کر دیا جائے۔

(نادیہ ممتاز، لاہور)

☆ ''سوال یہ ہے کہ......'' میں عمر کا کوئی تعین نہیں۔

میں اس رسالے سے کچھ ناراض ہوں کہ آپ نے میری کہانی ''کفایت شعاری'' شائع نہیں کی۔ میں نے امتحان میں تیسری پوزیشن لی ہے۔ (رمنا سعید، گوجرانوالہ)

☆ تیسری پوزیشن لینے پر آپ کو مبارک ہو۔

گم نام مسیحا، ضرب المثل کہانی اور نیلی روشنی کا راز بہترین کہانیاں تھیں۔ ماموں وائی فائی بالکل بھی مزے دار نہیں۔

(شہزاد وحید، لاہور)

میں ایک سال سے تعلیم و تربیت پڑھ رہا ہوں۔ اکتوبر کا کھوج لگایئے میں میرے نام کے ساتھ شہر کا نام غلط لکھا گیا ہے۔ درستگی کی التجا ہے۔ (محمد احمد، پینچہ ڈلنی)

☆ آئندہ خیال رکھا جائے گا۔

نومبر کا شمارہ دل چسپ تھا۔ ہیں وہی لوگ جہاں میں اچھے، گم نام مسیحا، تیس روپے والی مچھلی اور سچی لگن اچھی کہانیاں تھیں۔

(محمد حمزہ مقصود)

نومبر کا شمارہ ایک دفعہ پھر دوسرے شماروں سے بازی لے گیا۔ تمام کہانیاں بہت پسند آئیں۔ خاص طور پر ماموں وائی فائی نے تو آتے ہی دھوم مچا دی۔ میرا مشورہ ہے کہ پسندیدہ اشعار کا سلسلہ بھی شروع کیا جائے۔ (مریم سلیمان بٹ)

میں تعلیم و تربیت کا نیا قاری ہوں اور پہلی بار خط لکھ رہا ہوں۔ میں نے اس سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ (محمد عاطف منہاس، گوجرانوالہ)

نومبر کا شمارہ بہت زبردست تھا۔ کافی عرصہ سے تعلیم و تربیت کا باقاعدگی سے مطالعہ کر رہا ہوں۔ (محمد بلال رضا، حسن ابدال)

☆ تعریف اور نشان دہی کے لیے شکریہ۔

تعلیم و تربیت واحد رسالہ ہے جو اپنے معیار کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ کیا کھوج لگایئے کا سلسلہ جاری رہے گا؟

(محمد افضل انصاری، لاہور)

نومبر کا شمارہ قابلِ تعریف تھا۔ تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ ہر کہانی میں کوئی نہ کوئی سبق ہوتا ہے۔ یہ میں پہلی بار خط لکھ رہی ہوں۔

(سیدہ ہاہم گفتار، واہ کینٹ)

نومبر کا شمارہ زبردست تھا۔ پہلی بار شرکت کر رہا ہوں۔ کیا آپ مجھے خوش آمدید نہیں کہیں گے۔ (محمد زین عظمت، گوجرانوالہ)

☆ ہم آپ کو تعلیم و تربیت میں خوش آمدید کہتے ہیں۔

ان بچوں کے خطوط بھی ہمیں موصول ہوئے: سمیحہ شاہد، لاہور۔ عشاء سعید، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ ثنا رانی، گجرات۔ عائشہ ثاقب جنجوعہ، عاشی جنجوعہ، راجہ ثاقب محمود جنجوعہ، پنڈ دادنخان۔ سعدیہ فضل کریم، مہد نسیم، حمزہ اظہر، لاہور۔ عمران خان غوری، بہاول پور۔ عائشہ وارث، فیصل آباد۔ روشن زیب، ایبٹ آباد۔ عبداللہ انور، عرفان خان، جہلم۔ محمد نبیل افتخار، کراچی۔ احسان کبریا، بیڑے والا، بھکر۔ محمد حسان رضا خان، واہ کینٹ۔ اسامہ خٹک، پشاور۔ محمد عثمان، راول پنڈی۔ آمنہ ارشد، ٹیکسلا۔ علینہ احمد، راول پنڈی۔ محمد عرفان اقبال، دنیا پور۔ سید نقیب الفضل ہاشمی، سید ابصام حیدر ہاشمی، راول پنڈی۔ عائشہ کریم، ملتان۔ شاہ منصور، صوابی۔ اروی معطر بیگ، گجرات۔ ثمرہ طارق بٹ، گوجرانوالہ۔ علینہ اظہر، اسلام آباد۔

☆......☆......☆

آج جب مَیں گھر سے نکلا تو موسم بہت خوش گوار لگ رہا تھا۔ راستے پہ چلتے کسی بھی شخص سے اکتاہٹ نہیں ہو رہی تھی۔ مجھے اپنا آپ بہت ہلکا محسوس ہو رہا تھا۔ اتنی سخت دھوپ میں بھی گرمی کا احساس کوسوں دُور تھا۔ مَیں اپنے خیالوں میں مگن چلتا جا رہا تھا کہ کچھ آوارہ لڑکوں کی موٹر سائیکل سے ٹکر ہوئی تو اپنا ماضی یاد آ گیا۔ (یہ الگ بات تھی کہ مَیں اپنا ماضی کبھی بھولا ہی نہیں تھا۔) کچھ باتوں کو انسان بھولنا نہیں چاہتا اور کچھ کو چاہ کر بھی بھول نہیں پاتا۔

بڑا بیٹا ہونے کے ناتے مجھے کبھی کسی چیز کی کمی محسوس نہ ہوئی۔ والد صاحب پولیس میں آفیسر تھے، لہٰذا وہ اکثر و بیشتر گھر میں ہی پائے جاتے۔ گھر میں پیسا تو بے تحاشا تھا مگر پوچھنے والا کوئی نہ تھا کہ کہاں خرچ ہوا اور کیسے ہوا؟ اس لیے مجھے بھی احساس ہی نہ ہوا کہ ان چیزوں کے علاوہ بھی زندگی میں کچھ ضروری ہے۔ دوست بھی آوارہ ہی ملے جو خود غرض اور مطلب پرست تھے۔ ان کے ساتھ بہت سی بُری عادتوں میں پڑ گیا۔ رات کو اس وقت گھر آتا جب سب سو چکے ہوتے۔ مَیں محلے میں ایک بدمعاش کی حیثیت سے جانا جاتا تھا۔ ہر کوئی مجھے دیکھ کر اپنا راستہ بدل لیتا۔ کالج میں ایک تنظیم کا نمائندہ تھا، لہٰذا جب بھی کوئی گڑبڑ کرتا، اپنی تنظیم کو فون کرتا اور وہ مدد کو پہنچ جاتی۔ ہر کوئی میری عزت کرتا مگر یہ عزت صرف ڈر کی وجہ سے تھی۔ گھر میں سب کچھ تھا مگر سکون نہیں تھا۔ ایک ہی گھر میں رہ کر سب ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے۔ مَیں ہمیشہ یہی سمجھتا رہا کہ والد صاحب مجھ سے پیار نہیں کرتے۔

ایک دن بڑی بہن کو میرے بارے میں پتا چل گیا۔ اس سے پہلے ایک کزن نے بھی مجھے سگریٹ پیتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس نے بہت سمجھایا کہ آج کے بعد ایسی کوئی حرکت مت کرنا۔ مَیں نے اس کی بات پر عمل کرنے کی کوشش تو کی مگر یہ ممکن نہیں تھا۔ برسوں کی عادت کہاں ایک دم سے ختم ہوتی ہے؟

میرے بارے میں جاننے کے بعد بھی میری بہن خاموش تھی۔ اس بات پہ مجھے کوئی حیرت یا دکھ نہیں تھا کیوں کہ مَیں جانتا تھا کہ باقی سب کی طرح انہیں بھی صرف اپنے آپ سے مطلب ہے، کسی کی کوئی پروا نہیں مگر ایک دن جب رات گئے گھر لوٹا تو انہیں اپنے کمرے میں دیکھ کر حیرت کے مارے بوکھلا سا گیا۔

''آ...ا...آپ...اپیا...اپیا! آپ میرے کمرے میں؟''

بس تمہارا انتظار کر رہی تھی۔

''میرا انتظار... مگر کیوں؟ مَیں آپ کے لیے اتنا اہم کب

سے ہو گیا؟" وہ بولیں۔ "تم تو ہمارے لیے ہمیشہ سے اہم ہو اور رہو گے۔ مَیں تو آج تک یہی سمجھتی رہی کہ تم بہت محنت سے پڑھ رہے ہو، اپنی زندگی انجوائے کر رہے ہو۔"

"ہاں ایسا ہی ہے۔ مَیں اپنی زندگی انجوائے ہی تو کر رہا ہوں۔" مَیں نے جواب دیا۔

"دیکھو رامز! یہ زندگی نہیں ہے جو تم جی رہے ہو۔" وہ بولیں۔ "زندگی تو بہت مختصر ہے۔ اتنی مختصر کہ آنکھ سے شروع ہو کے ہونٹوں پہ ختم ہو جائے۔"

اُن کی بات میں بہت گہرائی تھی۔ اتنی گہرائی کہ ہر کوئی اپنے ذہن کے مطابق اس کا مطلب نکال لے۔ اس لیے ان کی بات میرے اوپر سے ہی گزر گئی اور مَیں نے اُن سے کہا۔ "ایسا! کیا آپ مجھے اس کا مطلب سمجھائیں گی؟" وہ بولیں۔ "ہاں کیوں نہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ کسی غم زدہ دکھی انسان کی آنکھوں کے آنسو اپنے دامن میں سمیٹ کر ان کی جگہ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیرنا۔ بس اتنی ہی ہے زندگی۔ اپنے لیے ہر کوئی جیتا ہے، خوش رہتا ہے، اچھے یا بُرے طریقے سے اپنی زندگی کو لطف اندوز کرنے کا سامان ڈھونڈ لیتا ہے مگر ہر طرح کی کوشش کے باوجود کبھی کبھی خوش نہیں ہو پاتا۔ حقیقی خوشی وہ چاہ کر بھی نہیں حاصل کر پاتا کیوں کہ وہ یہ بھول جاتا ہے کہ حقیقی خوشی دوسروں کو خوش کر کے، ان کے غم بانٹ کے اور اچھے راستے پر چل کر ملتی ہے، نہ کہ ان کو دکھی کر کے۔ دیکھو تمہاری وجہ سے کتنے لوگ دکھی ہوتے ہیں۔ تمہاری چھوٹی سی غلطی کا خمیازہ انہیں کسی بڑے نقصان کی صورت میں بھگتنا پڑتا ہوگا۔ تم یہ سب چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟"

ان کی بات سُن کے مَیں پہلے تو چپ ہو گیا پھر ان کے دوبارہ پوچھنے پہ بولا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ایک ایسا شخص جو بُرائیوں کی دلدل میں دھنسا ہو، ان سے باہر کیسے آ سکتا ہے؟" وہ بولیں۔ "اگر ہمیں اپنی منزل کو پانا ہے تو اس کے لیے آگے بڑھنا ہوگا۔ ہم پہلا قدم اٹھائیں گے تب ہی آگے کی جانب بڑھ پائیں گے ناں! اگر پہلا قدم ہی نہیں اٹھائیں گے تو آگے کیسے بڑھیں گے، منزل تک کیسے پہنچیں گے؟ دیکھو میرے بھائی! خوش قسمتی ہمارے دروازے پر بار بار دستک نہیں دیتی۔ تمہارے پاس خود کو بدلنے کا موقع ہے، اسے ضائع مت کرو۔ ہمت کرو اور تمام بُرائیوں کو چھوڑ کر اچھائی اور سچائی کے ساتھ آگے بڑھو۔ بے شک یہ راستہ تمہارے لیے بہت کٹھن ہوگا۔ تمہیں بہت سی رکاوٹوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا لیکن اگر تم نے ہمت سے کام لیا تو یاد رکھنا، تمہاری منزل بہت پُرسکون اور شان دار ہوگی۔"

مجھے زندگی میں پہلی بار کسی نے اس طرح پیار سے سمجھایا تھا۔ کچھ اچھا کرنے، خود کو بدلنے کی ترغیب دی تھی۔ ان کی باتوں نے مجھے کافی حد تک اندر سے بدل ڈالا تھا۔ اچھا کرنے کا حوصلہ بھی پیدا ہو گیا تھا۔ بس اب پہلا قدم اٹھانے کی دیر تھی۔ مَیں جانتا تھا کہ مجھے پہلے قدم پر ہی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا، مگر قدم تو اٹھانا ہی تھا۔ مَیں نے اگلے ہی دن اپنی تنظیم کو فون کر کے کہہ دیا کہ اب مَیں کوئی غلط کام نہیں کروں گا، نہ آپ لوگوں کا ساتھ دوں گا۔ اس پر ان کو بہت غصہ آیا جس کے لیے مَیں پہلے ہی خود کو تیار کر چکا تھا کیوں کہ مَیں جانتا تھا کہ ان کا ساتھ چھوڑنے کی صورت میں اس طرح کے مسائل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہاں تک کہ میری جان بھی جا سکتی ہے لیکن مَیں نے اپنی بہن کی آنکھوں میں امید کی جو کرن دیکھی تھی، اسے بجھنے نہیں دینا چاہتا تھا۔

اپنی تنظیم کو فون کرنے کے بعد مَیں نے اپنا موبائل ہمیشہ کے لیے بند کر دیا اور اپنا حلیہ بھی درست کر لیا۔ پانچوں وقت کی نماز باجماعت ادا کرنے لگا۔ مَیں پہلا قدم اٹھا چکا تھا اور کافی حد تک مطمئن بھی تھا مگر دکھ تھا تو صرف اس بات کا کہ کاش! میرے گھر والے مجھ پر توجہ دیتے۔ مجھ سے پوچھتے کہ کہاں جا رہے ہو، رات کو دیر سے گھر کیوں آتے ہو؟ جو پیسے ملتے ہیں اُنہیں کہاں خرچ کرتے ہو؟ اگر مجھ سے یہ سوالات کیے جاتے تو شاید آج میرا شمار بھی اچھے لوگوں میں ہوتا۔ زندگی میں پہلی بار احساس ہوا کہ پیسہ، گھومنا پھرنا، آوارہ گردی کرنا، دوسروں پر حکم چلانا، ان کو ڈرانا ضروری نہیں ہوتا۔ اگر کچھ ضروری ہوتا ہے تو وہ ہے ماں باپ کا پیار اور ان کی توجہ۔

مجھے خود کو بدلنے کی کوشش میں بہت ساری مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ کسی نے سچ ہی کہا تھا کہ ایک اچھے انسان کے لیے مزید اچھا بننا اتنا مشکل نہیں ہوتا جتنا ایک بُرے انسان کے لیے اچھا بننا
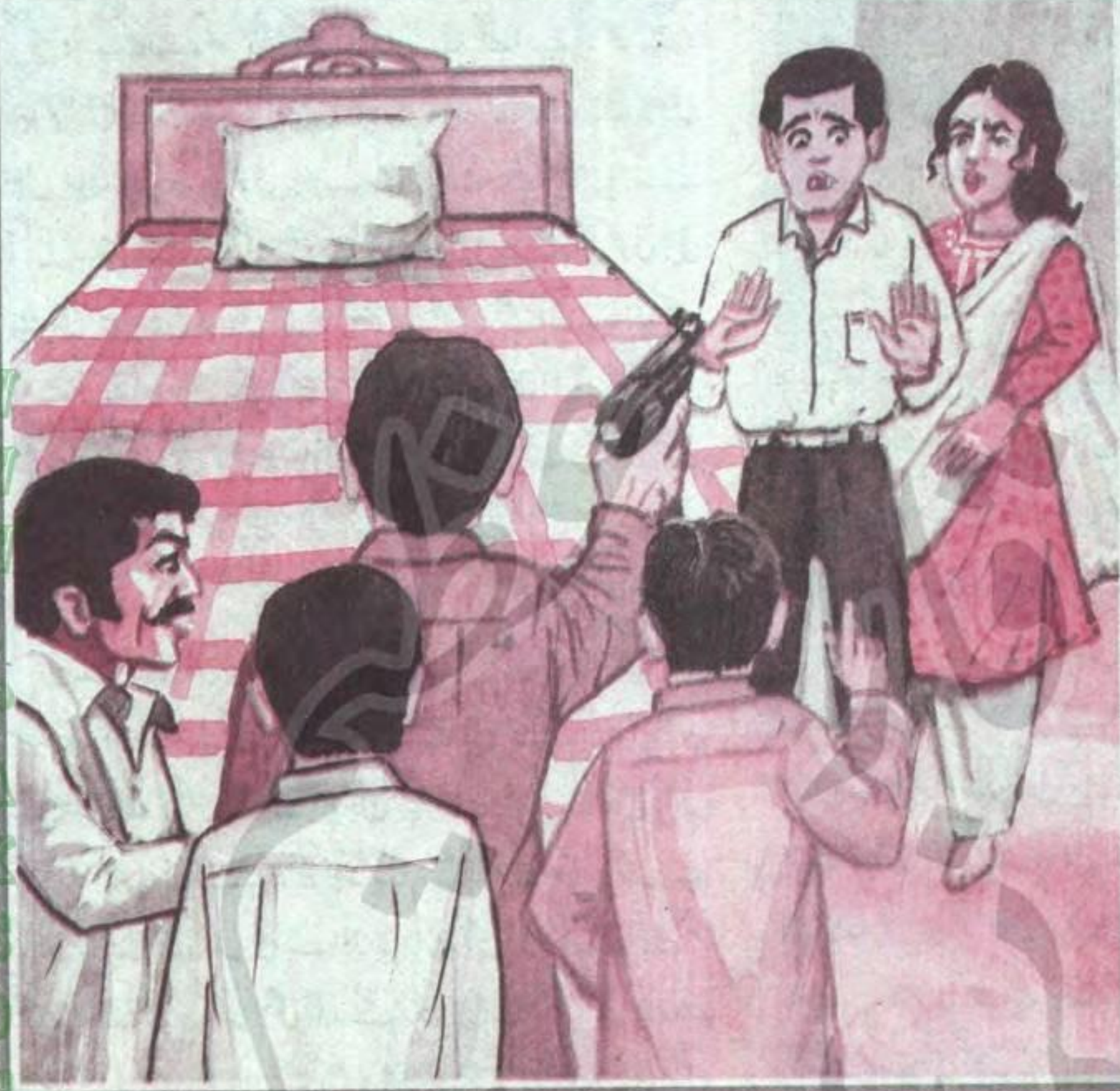
کیوں کہ ہمارے معاشرے میں ایک بُرے انسان کو اچھے روپ میں برداشت کرنا قابل قبول نہیں ہوتا۔ کل تک جو لوگ میرے سامنے آتے ہی نظریں جھکا لیتے تھے، آج وہ مجھ پر طرح طرح کی آوازے کستے۔ پہلے اگر کسی دُکان پر کوئی چیز لینے جاتا تو دُکان دار لمبی لائن کے باوجود پہلے مجھے فارغ کر دیتا مگر اب کہا جاتا کہ رامز بھائی! انتظار کیجیے، آپ کی باری ابھی نہیں آئی۔

شروع شروع میں مجھے بہت غصہ آتا مگر پھر بہن کی بات یاد آجاتی کہ تمہیں خود کو بدلنا ہے۔ کل تک جو لوگ تمہارے ڈر کی وجہ سے تمہاری عزت کرتے تھے، کوشش کرو کہ وہ تمہارے اچھے اخلاق کی وجہ سے تمہاری عزت کریں۔ بُرا انسان جب اچھا بننا چاہتا ہے تو لوگوں کی طنزیہ نظریں، ان کے طعنے اسے اس کی ہی نظروں میں گرا دینے کے لیے کافی ہوتے ہیں مگر ایسی صورت میں صرف ہمت والے ہی آگے بڑھتے ہیں۔ صرف وہی لوگ ان طنز بھری نظروں اور طعنوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں جن میں کچھ اچھا کرنے کا جذبہ ہو۔

لیکن اپیا! مَیں تو بہت بُرا ہوں۔ ایک دن مَیں نے انتہائی مایوسی کی کیفیت میں اپنی بہن سے کہا تو وہ بولیں۔ ”میرے پیارے بھیا! انسان بذاتِ خود بُرا نہیں ہوتا، بس بعض دفعہ وقت اور کچھ حالات اسے بُرا بنا دیتے ہیں۔ تم بُرے نہیں ہو، تمہیں بھی حالات نے ایسا بنا دیا مگر اللہ کا جتنا بھی شکر ادا کرو، کم ہے کہ تم سیدھے راستے پر لوٹ آئے۔ ورنہ کچھ لوگوں کو تو لوٹنے میں عمریں بیت جاتی ہیں۔ بس اب کوشش کرنا کہ تمہاری وجہ سے کسی کو کوئی دکھ یا تکلیف نہ پہنچے۔ دوسروں میں خوشیاں بانٹ کے جیو۔ اب اگر کبھی کوئی غلطی ہو جائے تو اس کی معافی مانگ کے آئندہ وہ غلطی نہ کرنے کا عہد کر لو۔ اس طرح تمہارا ضمیر بھی مطمئن ہوگا اور تمہاری معافی سے دوسروں کے چہرے پہ مسکراہٹ بھی آجائے گی۔

اب جب مَیں اپنی تمام بُری عادتیں چھوڑ کر اچھائی کے راستے پر گامزن تھا تو نہ جانے کہاں سے میرے والد صاحب کو میرے ماضی کی خبر ہوگئی، انہوں نے مجھ سے کچھ بھی پوچھے بغیر میرا جیب خرچ بند کر دیا۔ تاہم، مجھے اس بات سے بہت خوشی ہوئی کیوں کہ اس دن مجھے احساس ہوا کہ چلو زیادہ نہیں تو کم از کم ان کے پاس میرے لیے کچھ وقت تو ہے۔

مَیں اپنی اس زندگی سے بہت خوش اور مطمئن تھا لیکن تنظیم کا خوف اکثر بے چین کر دیتا کیوں کہ مَیں جانتا تھا کہ وہ لوگ اتنی آسانی سے مجھے چھوڑنے والے نہیں۔ ایک دو دفعہ اپیا سے اس بارے میں ذکر کیا تو وہ بولیں۔ ”تم فکر مت کرو، اللہ مالک ہے۔ تمہیں انشاء اللہ کچھ نہیں ہو گا۔“ اور ہوا بھی ایسے ہی۔ ایک دن

تنظیم والے میرے گھر پہنچ گئے۔ انہوں نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کو کہا تو مَیں نے انکار کردیا۔ میرا انکار کرنا تھا کہ انہوں نے پستول نکال لیا۔ وہ مجھ پر گولی چلانے ہی والے تھے کہ اپیا سامنے آگئیں۔ اس سے پہلے کہ مَیں کچھ سمجھتا، وہ میرے حصے کی گولی اپنی سینے میں پیوست کروا چکی تھیں۔ تنظیم کے لڑکے بھی ان کے اچانک سامنے آنے اور گولی لگنے سے بدحواس ہوچکے تھے، اس لیے انہوں نے بھاگنے میں ہی عافیت جانی لیکن چوں کہ فائرنگ کی آواز سے کافی لوگ اکٹھے ہوچکے تھے، لہٰذا وہ بھاگنے میں کامیاب نہ ہوپائے۔

مَیں خون میں لت پت اپیا کو لیے اسپتال پہنچا، تب تک میرے والد صاحب بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ چند گھنٹے کے آپریشن کے بعد جب ڈاکٹر صاحب آپریشن تھیٹر سے باہر آئے تو بتایا کہ گولی تو نکال دی گئی ہے مگر مریضہ کے بچنے کا کوئی امکان نہیں ہے کیوں کہ گولی دل میں لگی ہے اور یہ بات بھی کسی معجزے سے کم نہیں کہ اس کی سانسیں ابھی تک چل رہی ہیں۔ ڈاکٹر سے اجازت لے کر مَیں جیسے ہی ان کے پاس پہنچا تو میرے آنسوؤں کی لڑی رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی مگر وہ بالکل ساکت اور مطمئن دکھائی دے رہی تھی۔ اُنہوں نے میرے ہاتھ کا لمس اپنے ماتھے پہ محسوس کرتے ہی اپنا آکسیجن ماسک ہٹایا اور دھیرے سے آنکھیں کھولتے ہوئے بولیں۔ ”رامز! زندگی میں اب کبھی غلط راستے کی طرف مت جانا کیوں کہ اس کا انجام بہت بُرا ہوتا ہے۔ بعض اوقات انسان کو اس کی قیمت کسی اپنے کی جان دے کر ادا کرنی پڑتی ہے۔“

”مگر اپیا! میری غلطیوں کی سزا آپ کو کیوں ملی؟ مجھے ملنی چاہیے تھی ناں! میں کبھی بھی خود کو معاف نہیں کرپاؤں گا کہ میری وجہ سے......“

میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی وہ بولیں۔ ”تمہاری وجہ سے کچھ بھی نہیں ہوا۔ آج کے بعد ایسا سوچنا بھی مت۔“ اس کے ساتھ ہی ان کے چہرے پہ ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ دوبارہ بولیں۔ ”میرے پیارے بھیا! ہم دونوں الگ تو نہیں ہیں ناں! مجھے تو خوشی اس بات کی ہے کہ مَیں تمہارے کچھ تو کام آئی۔“

”لیکن اپیا! آپ کے بعد میرا کیا ہوگا؟ مَیں کس کی گود میں سر رکھ کے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کیا کروں گا؟ جب میرے قدم ڈگمگائیں گے تو کون مجھے ثابت قدم رہنے کی نصیحت کرے گا؟“ وہ بولیں۔ ”تم فکرمت کرو، زندگی میں تمہیں جب بھی میری ضرورت ہوگی خاص کر کسی بھی مشکل گھڑی میں، تو تم مجھے اپنے ساتھ پاؤ گے۔ مَیں اس دُنیا میں نہ ہوکر بھی تمہارے ساتھ رہوں گی۔“ وہ مزید کچھ کہنا چاہ رہی تھیں مگر زندگی نے انہیں مہلت نہ دی۔

ان کی موت کے بعد مَیں کئی دن تک اپنے کمرے میں بند رہا، پھر مجھے احساس ہوا کہ اس طرح تو میری بہن کی قربانی رائیگاں چلی جائے گی۔ مَیں ان کی قربانی کیوں رائیگاں جانے دوں۔ مجھے ان کی ہر بات پہ عمل کرنا ہے۔ ان کے بتائے ہوئے راستے پہ چلنا ہے۔ پھر مَیں نے ایسا ہی کیا۔ وقت گزرتا گیا اور مَیں ایک بُرے انسان سے اچھا انسان بن گیا۔ پہلے جو لوگ ڈر کی وجہ سے میری عزت کرتے تھے، اب وہ دل سے عزت کرنے لگے تھے۔ میری وجہ سے کئی اور نوجوان بُرائی کی دلدل سے نکل کر اچھائی کے راستے پر گامزن ہوچکے تھے۔ کئی ایک گھرانوں کی کھوئی ہوئی خوشیاں لوٹ چکی تھیں کیوں کہ مَیں جب بھی گھر سے نکلتا تو یہ سوچ کے نکلتا کہ کہیں میری طرح کوئی اور رامز راستے سے بھٹک نہ جائے اور ہر کوئی مجھ جیسا خوش قسمت تو نہیں ہوتا جسے اتنی اچھی بہن ملے جو اس کی دوست بھی ہو۔ میری اپیا کہتی تھیں کہ رامز! ایک بہن سے اچھا بھائی کا کوئی اور دوست ہو، ایسا کم ہی ہوتا ہے۔ مَیں جب بھی اداس ہوا یا کہیں میرے قدم ڈگمگائے تو مَیں نے انہیں اپنے ساتھ پایا۔ وہ ہمیشہ ایک احساس کی طرح میرے ساتھ رہیں اور وقت کی کایا ایسی پلٹی کہ مَیں جو سمجھتا تھا کہ میرے والد صاحب مجھ سے پیار نہیں کرتے۔ اب سمجھتا ہوں کہ وہ اس دُنیا میں مجھ سے زیادہ کسی سے پیار نہیں کرتے۔ وہ بھی اب سمجھ چکے تھے کہ اس دُنیا میں سب سے قیمتی شے، محبت اور اپنا وہ قیمتی وقت ہے جو آپ کسی کے نام کرتے ہیں، مگر افسوس..... اُنہیں یہ احساس بھی اپنی ہیرا سی انمول بیٹی کھوکر ہوا۔

زندگی میں انھوں نے سب پالیا مگر بیٹی کی کمی کبھی پوری نہ ہو سکی۔ وہ خلا کبھی پُر نہ ہوسکا مگر میری اپیا جاتے جاتے مجھے ہر لحاظ سے مکمل کرگئیں۔

☆☆☆

آپ بھی لکھیئے

زندگی کی ڈائری

(اکرم نواز، لاہور)

آج کا دن میری زندگی کے خوشگوار دنوں میں سے ایک رہا۔ یہ ایسا دن تھا جس نے ماضی کے اوراق پر پڑی گرد کو جھاڑ کر مجھے وہ وقت یاد دلایا جب میں نے تبدیلی کا ایک بیج بویا تھا، ہمارے معاشرتی رویوں کی تبدیلی اور آج میں نے اس بیج کو ایک تناور درخت کی شکل میں پایا۔

آج میرے بیٹے کی خوشی دیدنی تھی۔ اس کی ننھی سی مسکان پر میرا انگ انگ قربان جا رہا تھا۔ آج جب وہ اپنی امی کے ساتھ بازار سے لوٹا تو اس کے ہاتھ میں چاکلیٹ تھی، جسے دیکھ کر مجھے خاصی حیرت ہوئی۔ حیرت اس بات پر تھی کہ اسے چاکلیٹ میں کبھی بھی خاص دلچسپی نہیں رہی تھی، مگر آج تو جیسے اس کی نظریں چاکلیٹ سے ہٹ ہی نہیں رہی تھیں۔ وہ پورا دن چاکلیٹ ہاتھ میں لیے گھومتا رہا اور گھر میں سب کو دکھاتا رہا۔ جب اس نے شام تک چاکلیٹ نہیں رکھی تو میری بیٹی ازراہ مزاح بولی:

''ابو دیکھیں تو سہی، کہیں علی کی چاکلیٹ پر ایلفی تو نہیں لگی ہوئی۔'' ابھی وہ میرے سامنے بستر پر سو رہا ہے اور چاکلیٹ اس کے ہاتھ میں دبی ہوئی ہے، گو کہ وہ اس حد تک پگھل چکی ہے کہ اسے ''چاکلیٹ'' لکھتے ہوئے بھی مجھے ہنسی آ رہی ہے۔

وہ تو بعد میں میری بیوی نے راز کھولا کہ آج مارکیٹ میں ایک شخص علی کو دیکھ کر سمجھ گیا کہ یہ بچہ اسپیشل ہے وہ دُور سے تیز تیز چلتا ہوا آیا، میری بیوی سے اجازت لے کر میرے بیٹے سے ہاتھ ملایا، اسے پیار کیا اور اسے تحفتاً چاکلیٹ بھی دے دی۔ علی کو شائد یہ سب اتنا اچھا لگا کہ وہ پورا دن اس چاکلیٹ کو چھوڑنے پر آمادہ ہی نہیں ہوا۔ یقیناً یہ بچے بہت حساس ہوتے ہیں۔ علی کی خوشی دیکھ کر میں اچانک اپنے ماضی میں کھو گیا۔

یہ 30 برس پہلے کی بات ہے جب میں دسویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ اسکول سے دُور رہنے کی بناء پر اسکول کی وین میں آتا جاتا تھا۔ ہر اسکول کی طرح ہمارے اسکول کے باہر بھی مختلف ٹھیلوں والے جمع رہتے تھے۔ ایک دن میں بس میں بیٹھا بس کے چلنے کا انتظار کر رہا تھا کہ اچانک سٹے والے کے ٹھیلے سے شور و غل بلند ہوا۔ میں چونک کر اٹھا اور قریب گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اسکول کے بچے ایک بارہ سال کے بچے کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے ہیں اور شور مچا رہے ہیں۔ کوئی بچہ اس کے بال اچک رہا ہے تو کوئی اسے منہ چڑھا رہا ہے۔ کوئی اس کی نقل اتار رہا ہے تو کوئی اس سے ایسے پیچھے ہٹ رہا ہے جیسے وہ کسی چھوت کی بیماری میں مبتلا ہو۔ دراصل وہ بچہ ذہنی طور پر بیمار تھا۔ اس نے حلیہ بھی عجیب و غریب بنایا ہوا تھا اور وہ بچوں کو دیکھ کر ڈر جانے کے سبب رونے بھی لگا تھا جسے دیکھ کر بچوں کو مزید شہ مل رہی تھی۔

یہ مناظر دیکھ کر میرے دل کو ٹھیس سی لگی کہ ہم تو ایک عظیم مذہب کے پیروکار ہیں۔ وہ مذہب جس نے ہمیں آپس میں بھائی بھائی بنایا ہے، جس نے ہمیں اپنے مسلمان بھائیوں اور بہنوں کے حقوق پورا کرنے کا حکم دیا ہے اور ہم ہیں کہ ان سب احکامات کو پس پشت رکھ کر اپنے بھائیوں ہی کی تکلیف کا باعث بن رہے ہیں۔ میں نے اسی وقت بچوں کو ہٹایا، اس بچے کے پاس جا کر اس کے آنسو پونچھے اور اس کا ہاتھ پکڑ کر سب بچوں کو نرمی سے سمجھایا کہ یہ بھی ہمارا بھائی ہے۔ اگر قدرت نے اسے ہمارے جیسا ذہن نہیں دیا تو اس میں اس کا تو کوئی قصور نہیں ہے۔ ہمیں تو اس کی مدد کرنی چاہیے۔ یہ تو بلکہ ہم سے کئی گنا بہتر ہے کہ ہم تو ہر وقت گناہ میں مشغول رہتے ہیں اور یہ اتنا فرشتہ صفت ہے کہ گناہ بھی نہیں کرتا۔

پاس کھڑے سب بچے میری بات سمجھ گئے تھے۔ سب نے یک زبان ہو کر اس سے معافی مانگی اور ایک بچے نے تو اسے دو سٹے بھی خرید کر دیے۔

اس بچے کی قمیص پر اس کے گھر کا پتا لکھا ہوا تھا۔ میں اسے

اس کے گھر چھوڑ کر آیا جو اسکول سے پچھلی گلی میں تھا۔ میں نے اگلے دن اسکول جا کر اپنی پرنسپل سے بات کر کے باقاعدہ طور پر اسکول کے بچوں کا ایک گروپ بنایا جو ہمارے اسکول میں اور دوسرے اسکول میں جا کر اسپیشل بچوں کے موضوع پر تقاریر کر کے سمجھاتے تھے کہ یہ بچے ہم سے کم تر نہیں بلکہ برتر ہے۔

ہماری پرنسپل نے بھی متاثر ہو کر ہر جماعت میں اسپیشل بچوں کے لیے نشستیں مخصوص کر دیں اور سب اساتذہ پر ان بچوں کی تربیت سے متعلق کورس کرنا لازم کر دیا۔ آج میں نے علی کے ہاتھ میں چاکلیٹ دیکھی تو میں سمجھ گیا کہ مجھے میری نیکی کا پھل مل گیا ہے۔ کل میں نے کسی دوسرے کے بچے کو سکھ دیا تھا، آج قدرت نے میرے بچے کو سکھ دے دیا اور حقیقت بھی یہی ہے کہ میرے تینوں بچوں میں سے سب سے زیادہ علی میرا خیال کرتا ہے۔ ویسے تو مجھے میرے تینوں بچے ہی پیارے ہیں مگر علی کے لیے سب کے دل میں ایک الگ اور منفرد مقام ہے۔ دُعا ہے کہ یہ سلامت رہے، قدرت اسے صحت سے نوازے اور سب لوگوں کو اس طرح کی نیکی کا بیج بونے کی توفیق دے۔

(پہلا انعام: 120 روپے کی کتب)

توبہ

(زینب کامران قریشی، سرگودھا)

مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں باہر کس طرح نکلوں؟ باتھ روم کا دروازہ ٹائٹ ہونے کی وجہ سے میں اندر بند ہو گیا تھا۔ میں نے بہت کوشش کی مگر دروازہ نہ کھلا۔ آخر میں نے چیخنا شروع کر دیا۔ ''کھولو، دروازہ کھولو۔ میں اندر بند ہو گیا ہوں۔'' لیکن کسی نے دروازہ نہ کھولا۔ کوئی جاگ رہا ہوتا تو دروازہ کھولتا نا...... اس وقت تو رات کے تقریباً تین بج رہے تھے اور گھر میں میرے علاوہ سب سو رہے تھے۔ ایسے میں میری ماں نے اٹھ کر دروازہ کھولا اور میں باہر آ گیا۔ اچانک میرے ذہن میں خیال آیا کہ ابھی تو میری ماں میری مدد کے لیے آ گئی تھیں، لیکن آخرت کے وقت جب حساب ہو گا تب میری مدد کون کرے گا؟ اس وقت تو صرف میرے اعمال ہی مجھے بچا سکیں گے...... مگر میرے اعمال میں تو جھوٹ، دھوکا اور بدتمیزی کے سوا کچھ بھی نہیں......!! یہ سوچتے سوچتے میں ماضی میں کھو گیا۔ جب امی نے مجھے دو سو روپے تھمائے تھے اور کہا تھا۔

''بیٹا! ان پیسوں کی مجھے بازار سے سبزی لا دو۔'' لیکن جب میں بازار گیا تو میرے کانوں سے ایک آواز ٹکرائی۔ ''فروٹ چاٹ، صرف پچیس روپے میں۔'' یہ سننا تھا کہ میں فوراً اس فروٹ چاٹ والے کے ٹھیلے کی طرف لپکا اور یوں میں نے ان پیسوں میں سے پچیس روپے کھا لیے۔ پھر اسی طرح میں نے باقی پیسے بھی کولڈ ڈرنک، چپس، گول گپے اور جوس وغیرہ پر خرچ کر دیئے اور گھر پہنچ کر میں نے معصوم سی شکل بنا کر امی سے جھوٹ بول دیا کہ راستے میں مجھے دو شرارتی لڑکوں نے تنگ کیا اور پیسے بھی چھین لیے۔ یہ سن کر امی نے مجھے اپنے گلے سے لگا لیا اور بولیں۔ ''شام کو تمہارے ابو آ جائیں تو انہیں بتانا۔''

☆☆☆

ابو، ابو مجھے شیری اور مٹھو نے مارا بھی ہے اور مجھ سے پیسے بھی چھین لیے ہیں۔ شیری اور مٹھو کا گھر گلی کے آخر میں تھا، وہ دونوں واقعی بہت شرارتی تھے۔ ابو پہلے ہی ان کی شرارتوں سے تنگ تھے، یہ سن کر وہ فوراً اٹھے اور ان دونوں کی شکایت لگانے کے لیے ان کے گھر کی طرف بڑھے۔ بعد میں ان دونوں بھائیوں کو ان کے والدین سے خوب ڈانٹ پڑی اور میں انہیں ان کے گھر کی کھڑکی سے دیکھ کر ہنستا رہا۔ اسی طرح ایک اور واقعہ میرے ذہن میں گردش کرتا ہوا آیا۔ جب میں نے پروفیسر ''ایل جی'' کی گاڑی کے ٹائر کی ہوا نکال دی تھی، جب کہ مجھے معلوم تھا کہ پروفیسر صاحب کو ایک جگہ ملازمت کے لیے انٹرویو دینے جانا ہے۔ انہیں پہلے ہی دیر ہو رہی تھی، اب جب پتا چلا کہ گاڑی کے ٹائر میں ہوا ہی نہیں ہے تو بہت پریشان ہوئے اور پیدل جانے کا فیصلہ کیا۔ بہت مشکل سے جب پیدل انٹرویو دینے پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ آدھا گھنٹہ لیٹ پہنچے ہیں اور اس طرح انہیں وہ ملازمت نہ مل سکی۔ ابھی اور بہت سے واقعات میرے ذہن میں تھے کہ فجر کی اذان کے کلمات میرے کانوں میں گونجنے لگے اور میں ماضی سے حال میں آ گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ میں نے اپنے آنسو صاف کیے اور سچے دل سے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی اور یہ تہیہ کر لیا کہ اب میں اپنی دُنیا اور آخرت دونوں کو سنوارنے کی کوشش کروں گا۔ پھر میں نے وضو کیا اور ابو کے ساتھ فجر کی نماز پڑھنے چلا گیا۔

(دوسرا انعام: 100 روپے کی کتب)

خوشی کی بوندیں

(محمد شمیم عالم، اوکاڑہ)

گرج چمک کے ساتھ بارش ہو رہی تھی اور آسمانی بجلی مختلف قسم کے زاویے بنا رہی تھی۔ اس اثناء میں ایک گاڑی جس میں چھ آدمی سوار تھے، ایک شان دار بنگلے کے قریب آ کر رکی۔ جب بارش تھم گئی اور آندھی رک گئی تو گاڑی میں سوار لوگوں نے اپنا کام دکھانا شروع کر دیا۔ ان میں سے ایک نے دیوار پھلانگ کر اندر سے دروازہ کھولا اور دو چوکیدار جو پہرا دے رہے تھے، ان میں سے دو ساتھیوں نے ان کے پیچھے سے ان کی گردن پر کاری ضرب لگا کر انہیں بے ہوش کر دیا۔ پھر مختلف طریقوں سے گھر کا قیمتی سامان لوٹ لیا۔ ''نبیل! جلدی سے گاڑی کو موڑ۔'' یہ روحیل کی آواز تھی جو گردش زمانہ کا ستایا ہوا تھا۔ کچھ دنوں پہلے ہی جب روحیل کا ایڈمیشن ایک یونی ورسٹی میں ہوا تو ساتھ ہی اس نے گھر کے حالات سے تنگ آتے ہوئے نوکری کی تلاش کرنی شروع کر دی۔ بہت دوڑ دھوپ کی نوکری کہیں نہ ملی۔ ایک دن اس کے دوست شکیل نے پوچھا۔ ''آج کل تم بہت پریشان ہو خیر تو ہے نا۔'' ''بس یار کہیں نوکری نہیں مل رہی۔'' روحیل نے مایوسی سے جواب دیا۔ ''ہاہاہا...... نوکری! آج کل نوکری کہاں سے ملتی ہے۔'' شکیل نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''اگر میں تمہیں مخلصانہ مشورہ دوں تو تم ہمارے گینگ میں شامل ہو جاؤ اور پھر عیش کرو گے، عیش!'' شکیل نے بات سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''گینگ! کونسی گینگ؟'' روحیل نے تجسس سے پوچھا۔ ''ہمارے کچھ ساتھیوں نے گینگ بنا رکھا ہے جو ایک ماہ کے اندر کوئی گاڑی یا کوئی گھر لوٹتی ہے۔'' شکیل نے ساری وضاحت کر دی اور پھر کہا۔ ''کیا خیال ہے؟'' پہلے تو روحیل نے نفرت کا اظہار کیا مگر جب گھر میں بوڑھے باپ اور اپنے تعلیمی اخراجات کا خیال آیا تو ہاں کر دی۔ پھر شکیل نے روحیل کو اپنے باقی دوستوں سے ملوا دیا۔ ایک دن روحیل نے سرپرائز کے طور پر اپنی ماں کو بہت سے نوٹ پکڑائے۔ ''پیسے؟ یہ کہاں سے آئے۔'' ماں نے فکر سے پوچھا۔ ''وہ امی دراصل مجھے نوکری مل گئی ہے اور یہ پہلی تنخواہ ہے۔'' روحیل نے بتایا۔

''جیتے رہو، بیٹا!'' ماں نے پیار سے کہا۔ پھر اس کے ابو نے بھی مبارکباد دی۔ پھر یونہی دو تین سال گزر گئے مگر روحیل کے والدین کو اصل حقیقت کا پتا ہی نہ چل سکا۔ ایک دن روحیل کو اٹھانے کے لیے اس کی ماں روحیل کے کمرے میں گئی۔ روحیل تو اپنے کمرے میں نہیں تھا مگر روحیل کے بیڈ پر پستول نظر آئی۔ ''پستول......'' روحیل کی امی نے خودکلامی کی۔

جب روحیل آیا تو اس کی ماں نے پوچھا۔ ''بیٹا یہ پستول۔'' ''امی وہ منیجر صاحب نے کہیں جانا تھا تو اس نے دیا تھا کہ کل لیتے آنا۔'' اپنی والدہ کو مطمئن کرتے ہوئے کہا۔ بالآخر برائی کبھی چھپی نہیں رہتی، اس نے ایک نہ ایک دن عیاں ہو جانا ہوتا ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ انسان کی برائیوں کو اس کے آئینہ میں دکھا دیتا ہے۔ ایک دن روحیل نہانے کے لیے ابھی گیا تھا کہ موبائل پر روحیل کو اس کے دوست نے میسج کیا۔ ''آج تم یونی ورسٹی مت آنا۔ آج ہم بہت اہم مشن پر جائیں گے، ہمارا ٹارگٹ بینک ہے۔ اگر ہمارا مشن کامیاب ہوا تو آج تمہیں خوش کر دیں گے۔'' اتفاقاً روحیل کا موبائل اس کے ابو کے پاس ہی پڑا رہ گیا۔ روحیل کے ابو نے میسج پڑھ لیا۔ جب روحیل کو کافی دیر ہوگئی تو اس کے دوست نے روحیل کو موبائل پر فون کیا مگر روحیل کے ابو نے کوئی جواب دیے بغیر تمام باتیں سن لیں۔ روحیل بُری طرح پھنس گیا۔ روحیل کے باپ کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کا بیٹا بھی اس طرح کر سکتا ہے۔ روحیل کے ابو نے روحیل کی امی کو بھی ساری بات بتا دی۔ اب بس روحیل کا انتظار تھا۔ بالآخر روحیل آ گیا۔ ''آؤ بیٹا آؤ! آج ہمیں تمہاری کرتوتوں کا پتا چل چکا ہے۔'' ''کک...... کو...... کونسی بات کا۔'' روحیل گھبراہٹ سے بولا۔ ''وہی بات کا جس کو تم ہمیں نوکری بتاتے آئے ہو۔'' روحیل کی امی رشیدہ بولیں۔ ''بیٹا! مجھے بے حد افسوس ہے کہ تم یہ کام بھی کر گزرو گے۔ میں نے تمہیں ساری زندگی حلال کما کر دیا اور آج تک ایک لقمہ حرام کا نہیں کھلایا۔ تو نے آج ہماری ناک کٹوا دی اور اوپر خدا تعالیٰ کو بھی ناراض کر دیا۔ اس سے اچھا تھا کہ میری کوئی اولاد ہی نہ ہوتی......'' روحیل کے ابو کہے جا رہے تھے۔ روحیل نے بھی محسوس کر لیا کہ اب تیری حقیقت کھل کر سامنے آ گئی ہے۔ ''مجھے تو اسی دن سے شک تھا۔ جب تم آندھی طوفان میں رات بارہ بجے گھر آئے تھے۔'' روحیل کی امی بھی اپنے بیٹے کی اصلاح کے لیے پیچھے نہیں رہیں۔ ''دُور ہو جاؤ ہماری نظروں سے، تم نے ہمارے سفید بالوں کا بھی خیال نہ کیا۔'' افتخار احمد نے اپنا چہرہ دوسری طرف کرتے ہوئے کہا اور پھر جانے کے لیے قدم اٹھائے۔ روحیل اپنے باپ کے پاؤں کو پکڑ کر معافی مانگنے لگا۔ بالآخر افتخار احمد نے روحیل کو سینے سے لگا لیا اور اس اثناء میں تینوں کی آنکھوں سے خوشی کی بوندیں ٹپکنے لگیں۔

(تیسرا انعام: 80 روپے کی کتب)

کھوج لگائیے!

ذہانت آزمائیں اور 500 روپے کی کتابوں کا انعام پائیں۔

احمد کے چچا ایک اسکول میں پڑھاتے تھے۔ اس لیے سبھی انہیں ماسٹر چچا کے نام سے پکارتے تھے۔ ماسٹر چچا ایک دل چسپ شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی عادت تھی کہ وہ بچوں سے بہت سوال کیا کرتے تھے۔ چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے باتوں ہی باتوں میں بہت کچھ سکھا دیتے تھے۔
آج انہوں نے ماڈل ٹاؤن کسی کام سے جانا تھا۔ بچوں سے مخاطب ہوئے اور پوچھا:
''پیارے بچو! لاہور ماڈل ٹاؤن سے 5 میل دور ہے۔ ایک شخص ڈیڑھ گھنٹے میں یہ فاصلہ طے کرتا ہے، تو بتاؤ پچاس آدمی کتنے گھنٹوں میں یہ فاصلہ طے کریں گے؟ بچو! آپ بھی کھوج لگائیے اور جواب لکھ بھیجیے۔

نومبر 2013ء میں شائع ہونے والے ''کھوج لگائیے'' کا صحیح جواب یہ ہے کہ ارشد کے پاس 25 روپے اور نعمان کے پاس 35 روپے تھے۔
نومبر 2013ء کے کھوج لگائیے میں قرعہ اندازی کے ذریعے درج ذیل بچے انعام کے حق دار قرار پائے ہیں:

1۔ حافظ اسامہ ظفر، کمالیہ
2۔ فائقہ ہمایوں، لاہور
3۔ مشعل احمد، گجرات
4۔ نعمان رضا قادری، کاموکی
5۔ محمد حذیفہ، گوجرانوالہ کینٹ

(نویں قسط)

آفتاب احمد

نیلی روشنی کا راز

ڈولتی چٹان

چھ بج رہے تھے۔ ندیم نے رائفل میں گولیاں بھر لی تھیں۔ ضرار نے بھی کارتوسوں کی پیٹی گردن کے گرد ڈال لی تھی۔ دونوں کوہِ نور کی طرف چل پڑے۔ جانے سے پہلے انھوں نے اپنے ہاتھوں اور پاؤں پر اچھی طرح دافع برق پانی ملا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ کوہِ نور سے شعاعیں نکلنے کا وقت ہونے والا تھا۔

"کیپٹن!" ضرار نے راستے میں پوچھا۔ "کوہِ نور کتنی دُور ہوگا؟"

ندیم نے کہا۔ "تین میل سے کم کیا ہوگا۔ یہ سفر بہت خطرناک ہے۔ اگر تمھیں ڈر لگتا ہے تو یہیں سے واپس ہو جاؤ۔ میں ریڈیم لینے کے لیے ہی نہیں جا رہا بلکہ اڈے کو تباہ کرنا میرا اصل مقصد ہے۔"

"کیپٹن، انسانوں کو ان وحشیوں سے بچانے کے لیے اگر میری جان بھی چلی جائے تو میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا۔" ضرار نے بڑے جوش کے ساتھ کہا۔

"شاباش، میرے شیر! مجھے تم سے ایسے ہی جواب کی توقع تھی۔" ندیم نے ضرار کے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔

آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور بجلی بار بار چمک رہی تھی۔ وہ نہایت احتیاط سے راستہ طے کر رہے تھے۔

آخر اونچے نیچے ٹیلوں سے ہوتے ہوئے وہ کوہِ نور کے قریب پہنچ گئے۔ اب وہ ایک بڑے سے ٹیلے پر کھڑے تھے۔ انھوں نے دائیں طرف نظر ڈالی، نیچے جھیل تھی۔

"میں حیران ہوں کہ ان لوگوں نے اتنی بڑی جھیل بنائی کیسے؟" ضرار نے کہا۔

"اس سے بھی حیران کن بات یہ ہے کہ جھیل کے نیچے ہی ان کا اڈا ہے۔" ندیم نے کہا۔

"یہاں سے جھیل کتنی نیچی ہوگی۔" ضرار نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کم از کم ایک ہزار فٹ نیچی ہے۔"

دونوں نے آگے بڑھنے کے لیے قدم بڑھایا ہی تھا کہ ضرار ٹھٹھک کر کھڑا ہوگیا۔

"کیا بات ہے؟" ندیم نے پوچھا۔

"اوپر دیکھیے۔" ضرار نے گھبرا کر کہا۔

ندیم نے اوپر نظر اٹھائی تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ایک لاکھوں ٹن وزنی چٹان، جو اوپر کی طرف سے ایک بہت بڑا گولا معلوم ہوتی تھی، ان کے سر کے عین اوپر موجود تھی۔ اس چٹان کی چوڑائی نیچے آ کر بہت کم رہ گئی تھی۔ جس جگہ وہ زمین سے جڑی ہوئی تھی وہاں اس کا گھیر پانچ چھ فٹ تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے بہت بڑی صراحی منہ کے بل کھڑی کر دی گئی ہے۔

''کیپٹن، میں نے ابھی ابھی اس چٹان کو ہلتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس کا نچلا حصہ اتنا پتلا ہے کہ تیز ہوا چلے تو ساری چٹان ڈولنے لگتی ہے۔ اگر یہ گر گئی تو ہم اس کے نیچے آ کر یوں پس جائیں گے جیسے ہاتھی کے پاؤں کے تلے چیونٹی۔'' ضرار نے خوف زدہ ہو کر کہا۔

''میں نے بھی اسے ہلتے ہوئے دیکھا ہے۔'' ندیم نے کہا۔ ''میرے خیال میں ہمیں اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، سینکڑوں سالوں کی بارشوں اور آندھیوں نے اس کا پیندہ بہت پتلا کر دیا ہے۔ میرے خیال میں یہ کئی سال تک اور اسی طرح رہے گی۔ خیر، چلو ہم اوپر چلتے ہیں۔''

دونوں نے ایک بار پھر جھیل کی طرف مڑ کر دیکھا۔ چند لمحے وہ وہاں کھڑے رہے اور پھر باتیں کرتے ہوئے آگے چل پڑے۔

''یہ اڈا جھیل کے نیچے ہے۔'' ندیم نے کہا۔ ''اسے تباہ کرنے کا ایک ہی طریقہ میرے ذہن میں آیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر ہمارے پاس بہت بڑا بم ہو تو جھیل میں دے ماریں۔ جھیل کی تہہ میں سوراخ ہو جائیں گے اور پانی اڈے میں داخل ہو کر تمام مشینوں کو تباہ کر دے گا۔''

''آپ اڈے کے بارے میں ہی سوچتے رہیں گے یا کسی اور چیز کا بھی خیال رکھیں گے؟'' ضرار نے کہا۔

''مثلاً کس چیز کا؟'' ندیم نے پوچھا۔

''دیکھیے، یہ چٹان پھر ہلی ہے۔'' ضرار بولا۔

ندیم نے بھی چٹان کو ہلتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ گہری سوچ میں پڑ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بولا۔ ''چلو، اس چٹان کو قریب سے جا کر دیکھیں۔''

''فائدہ؟'' ضرار نے پوچھا۔

''تم آؤ تو سہی۔'' ندیم کا چہرہ خوشی سے سرخ ہو گیا تھا۔

''میری تو اس ڈولتی چٹان کو دیکھ کر جان نکلی جاتی ہے اور آپ ہیں کہ خوش ہو رہے ہیں۔'' ضرار نے کہا۔

''ایک بات بتاؤ۔'' ندیم بولا۔ ''اگر یہ چٹان گر جائے تو بتاؤ کہاں جا کر ٹھہرے گی؟''

ضرار نے گردن گھما کر دیکھا اور کہنے لگا۔ ''میرے خیال میں یہاں سے جھیل تک ڈھلان ہے اور راستے میں اور کوئی رکاوٹ بھی نہیں۔ اس لیے سو فی صد امکان ہے کہ یہاں سے لڑھک کر سیدھی جھیل میں گرے گی۔''

''وہ مارا!'' ندیم نے چٹکی بجا کر کہا۔ ''اب آؤ اس چٹان کو قریب سے دیکھیں۔''

انھوں نے کئی چکر کاٹے اور دس منٹ کے بعد وہ اس چٹان کے قدموں میں تھے۔ ندیم بڑے غور سے چٹان کو دیکھ رہا تھا۔ جوں جوں وہ اسے دیکھتا، توں توں خوشی سے دیوانہ ہوا جاتا۔

اچانک ندیم نے کہا۔ ''ضرار، دیکھتے ہو یہ کیا ہے۔''

''چٹان کی بنیاد میں بہت سے سوراخ ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے خرگوش یا اسی قسم کے جانوروں نے سرنگیں بنا رکھی ہیں۔'' ضرار نے کہا۔

''بس یہی میں چاہتا تھا۔'' ندیم بولا۔

ضرار کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا، اس لیے وہ خاموش رہا۔ ندیم نے چند پتھر اکٹھے کیے اور خوب غور سے چٹان کی بنیاد کو دیکھنے کے بعد ایک جگہ پر رکھ دیے۔

''چلو، اب ریڈیم لیں۔'' ندیم نے زمین سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''چلیے!'' ضرار نے کہا۔ ''مگر اتنا وقت ضائع کرنے کا مطلب کیا ہے؟''

''یہ پھر بتاؤں گا۔'' ندیم نے کہا۔

ان کے سامنے کوہ نور تھا اور قدموں تلے نیلے رنگ کی زمین تھی۔ ہر جگہ ریڈیم موجود تھا مگر اس کے ساتھ مٹی اور دیگر کئی چیزیں ملی ہوئی تھیں۔ ندیم اور ضرار خاموشی سے آگے بڑھتے رہے۔ ایک

جگہ رک کر انھوں نے زمین کھودنا چاہی مگر اسی لمحے بجلی چمکی اور وہ ڈر کر ایک طرف ہو گئے ان کے قریب ہی دو تبتی اپنی زبان میں باتیں کرتے ہوئے گزرے۔ ضرار نے بندوق سیدھی کی۔ ندیم نے جلدی سے بندوق پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''ہم گولی نہیں چلائیں گے۔ کوشش کرو کہ بغیر لڑائی کے ہی ہمارا مقصد پورا ہو جائے۔''

ضرار نے بندوق نیچی کر لی۔ دونوں آدمی دُور جا چکے تھے۔

ندیم اور ضرار چند قدم اور آگے بڑھے۔ یہاں تین چار سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں اور اس کے بعد ایک بہت چوڑی چھت تھی۔ دونوں چھت پر آئے۔ وہاں انھیں ایک گڑھا نظر آیا۔ ندیم آگے بڑھا، اس نے جھانک کر دیکھا۔ کوئی آٹھ فٹ گہرا کنواں تھا۔ ''میرے خیال میں یہاں اچھی قسم کا ریڈیم مل سکتا ہے۔'' ندیم نے کہا۔

ندیم گڑھے میں کود گیا اور چاقو نکال کر گڑھے میں لگے ہوئے ایک پتھر کو کھرچنا شروع کر دیا۔ ضرار اوپر سے جھانک رہا تھا۔ پندرہ منٹ گزر گئے۔ اچانک بجلی چمکی اور ہر چیز صاف دکھائی دینے لگی۔ وہ دونوں تبتی کافی دُور جا کر پھر واپس مڑے۔ ضرار نے پھرتی سے گڑھے میں چھلانگ لگا دی۔ ندیم نے کہا۔ ''تم کس لیے آئے ہو؟''

''اگر میں نہ آتا تو وہ لوگ مجھے دیکھ لیتے اور مقابلے تک نوبت آ جاتی۔'' ضرار نے آہستہ سے کہا۔

ندیم خاموش رہا۔ تھوڑی دیر میں تبتی گڑھے کے قریب پہنچ چکے تھے۔ ندیم اور ضرار گڑھے کی تہہ میں بیٹھ گئے۔ تبتی کچھ دیر باتیں کرتے رہے، پھر وہ چلے گئے۔ ندیم کے ساتھ ضرار بھی زور لگا کر کنویں کی دیوار سے پتھر نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ دس منٹ اور گزر گئے، پتھر اب باہر آ چکا تھا۔

''افسوس، اس میں بھی مٹی ملی ہوئی ہے۔'' ضرار نے کہا۔

''بہرحال کچھ نہ کچھ ریڈیم اس میں سے حاصل تو ہوگا۔''

یہ پتھر چار فٹ لمبا، چھ انچ موٹا اور چار انچ چوڑا تھا۔ پتھر کیا تھا، مستطیل نما ڈنڈا سا تھا۔

ندیم نے ضرار کے کندھے پر پاؤں رکھ کر ریڈیم اور رائفل کنویں سے باہر رکھ دی اور پھر گڑھے سے باہر کود گیا۔ ایک مرتبہ پھر بجلی چمکی مگر آس پاس کوئی شخص نظر نہ آیا۔ ندیم نے ہاتھ پکڑ کر ضرار کو کنویں سے باہر نکالا۔ دونوں جلدی جلدی راستہ طے کرتے ہوئے ڈگمگاتی چٹان کے قریب پہنچ گئے، پھر وہ مختلف موڑ مڑتے ہوئے اسی جگہ پر آ گئے جہاں شاہین کھڑا تھا۔ بلال اور چاچی بڑی بے چینی سے جہاز کے قریب ٹہل رہے تھے۔

خونی مکھیاں

ضرار اور ندیم نے ذرا دُور ہی سے اپنے آنے کی اطلاع دے دی کیوں کہ ڈر تھا کہیں انھیں دشمن سمجھ کر آصف پھر ریوالور نہ نکال لے۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ ندیم نے قریب آ کر بلال سے کہا۔ ''کیا بات ہے تم پریشان دکھائی دیتے ہو؟''

''آصف اور لالہ غنی پتا نہیں کہاں چلے گئے۔''

''کس وقت سے غائب ہیں؟'' ندیم نے پوچھا۔

''کوئی ایک گھنٹے سے۔'' چاچی نے کہا۔

''بہت بُری بات ہوئی۔ تم نے انھیں تلاش کیا ہوتا۔'' ندیم نے کہا۔

''ہم نے اردگرد کی تمام جگہیں دیکھ ڈالیں اور آوازیں بھی دیں۔ سمجھ میں نہیں آتا انھیں زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔'' بلال نے پریشان ہو کر کہا۔

ندیم گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ کچھ دیر کے بعد بولا۔ ''ایک بات صاف ہے کہ تبتی انھیں ہرگز ہلاک نہیں کریں گے۔ وہ ہمیں زندہ گرفتار کر کے ساری عمر عذاب دینا چاہتے ہیں، اس وقت ہم انھیں ڈھونڈنے کہاں جائیں؟ صبح ہی کو کچھ ہو سکتا ہے۔ دو گھنٹے صبر کرو۔ یہ لو ریڈیم اور اسے جہاز کے اندر رکھ دو۔'' بلال ریڈیم لے کر جہاز کے اندر رکھنے چلا گیا۔

ندیم مختلف باتوں پر غور کرنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی تھی۔ بلال، چاچی اور ضرار کو امید تھی کہ ندیم، آصف اور غنی کو آزاد کرنے کا ضرور کوئی نہ کوئی طریقہ معلوم کر لے گا۔ دراصل ندیم کی ذہانت اور جرأت پر انھیں اتنا بھروسا تھا کہ وہ اس کے ہوتے ہوئے کبھی کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتے تھے بلکہ اس کی موجودگی میں سب بہادر بن جاتے تھے۔

دو گھنٹے گزر گئے، صبح ہوگئی۔ نیند ان چاروں سے کوسوں دُور بھاگ چکی تھی۔ سب پریشان تھے۔ اتنے میں کسی شخص کے دوڑنے کی آواز آئی۔

''دیکھو! کون ہے؟'' ندیم نے ضرار سے کہا۔

ضرار بلند آواز سے چلاّیا۔ ''کون ہے؟'' مگر بھاگنے والے نے کوئی جواب نہ دیا۔ ضرار پھر چلاّیا۔ ''بولو! ورنہ گولی چلا دوں گا۔'' اور یہ کہہ کر اس نے فوراً بندوق تان لی۔

کمبل میں لپٹے ہوئے دو آدمی ان کی طرف بے تحاشا بھاگے چلے آرہے تھے۔ ضرار کی آواز سن کر اگلا آدمی ٹھہر گیا اور دُور ہی سے چلاّ کر بولا۔ ''میں آصف ہوں اور میرے ساتھ غنی لالہ ہیں۔ ہمارے سر پر خونی مکھیاں چکر کاٹ رہی ہیں۔ جلدی سے آگ جلا لو، ورنہ یہ ہم سب کو ہلاک کر دیں گی۔''

ندیم، بلال، چاچی اور ضرار نے بڑی پھرتی سے اپنے آس پاس گھاس کا دائرہ بنایا اور اس کے اندر جا بیٹھے۔ ندیم نے ماچس جلائی اور گھاس جلنے لگی۔ تھوڑی دیر میں آصف اور عبدالغنی بھی آ گئے۔ انھوں نے آگ کے دائرے میں داخل ہو کر کمبل اتار دیے۔ خونی مکھیاں آگ دیکھ کر بھاگ گئیں۔

''کہاں تھے آپ لوگ؟'' ندیم نے پوچھا۔

''رات کے بارہ ایک بجے میں اور لالہ غنی پہرا دیتے وقت باتیں کر رہے تھے کہ اچانک لالہ غنی خاموش ہوگئے۔ میں نے انھیں پکارا تو وہ زمین پر لیٹ گئے تھے۔'' آصف نے کہا۔ ''دراصل بات یہ ہوئی کہ رات کے اندھیرے میں دو تبتی، جو ہماری نظروں سے غائب تھے، ہمیں گرفتار کرنے کا موقع ڈھونڈ رہے تھے۔ اندھیرے کی وجہ سے ان کا نیلا بادل ہمیں نظر نہ آ سکا۔ پہلے تو ایک تبتی نے پیچھے سے آ کر لالہ غنی کو گرفتار کیا اور پھر دوسرے نے میرے منہ میں کپڑا ٹھونس کر ہاتھ پاؤں باندھ دیے۔ اس طرح ان دونوں نے ہمیں گرفتار کیا اور اڈے کی طرف چل پڑے۔''

''میرے خیال میں۔'' ندیم بولا۔ ''اب یہ لوگ پچاس پچاس یا سو دو سو کی تعداد میں ہمیں گرفتار کرنے نہیں آئیں گے، کیوں کہ اس طرح انھیں نقصان ہوتا ہے۔ اب وہ ایک وقت میں صرف دو آدمیوں کو ہی بھیجتے ہیں۔''

''تمھارا خیال بالکل درست ہے۔'' عبدالغنی نے کہا۔

''خیر چھوڑیے اس بحث کو، پھر کیا ہوا؟'' ضرار نے پوچھا۔

''پھر انھوں نے ہمیں چنگ فرنگ کے سامنے پیش کیا۔ اس

نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ انھیں جیل میں ڈال دیا جائے۔ چنانچہ ہم ایک بدبودار کمرے میں بند کر دیے گئے۔ لالہ غنی کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ یہ لوگ ایک گھنٹے کے بعد ہمیں عذاب دینے کے لیے ایک کنویں میں پھینک دیں گے۔ اس کنویں میں لاکھوں اور کروڑوں سیاہ چیونٹے رہتے ہیں۔ جب کسی آدمی کو اس کنویں میں گرایا جاتا ہے تو وہ اس کا گوشت، ہڈیاں، کھال اور بال وغیرہ ہر چیز چٹ کر جاتے ہیں اور آدمی کا نام ونشان تک نہیں چھوڑتے۔ ہمیں موت سامنے نظر آ رہی تھی۔

اتنے میں ایک تبتی آیا۔ اس نے چند لمحے لالہ غنی سے باتیں کیں، پھر ایک پڑیا ان کے ہاتھوں میں تھما کر واپس چلا گیا۔

میں نے لالہ غنی سے اس تبتی کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے کہا کہ ایک مرتبہ میں نے اس کی جان بچائی تھی۔ تب سے یہ میرا بھائی بن گیا ہے۔ کہتا تھا جس طرح تم نے میری جان بچائی تھی، اسی طرح میں بھی تمھاری جان بچاؤں گا۔ اس نے مجھے ایک پڑیا دی ہے جس میں سفید پاؤڈر ہے۔ کہتا تھا کہ کنویں کے بالکل درمیان میں کودنا کیوں کہ وہاں ریت ہے اور اس طرح تمھیں چوٹ نہیں آئے گی۔ دوسری بات یہ کہ کنویں میں گرتے ہی سفید پاؤڈر اردگرد بکھیر دینا اس پاؤڈر سے چیونٹے مر جائیں گے۔

ایک گھنٹے کے بعد چار تبتی آئے اور ہمیں کنویں کے پاس لے گئے۔ پہلے انھوں نے لالہ غنی کو کنویں کی منڈیر پر کھڑا کیا اور کودنے کے لیے کہا۔ لالہ غنی نے خوب اچھی طرح اندازہ کرنے کے بعد کنویں کے بالکل بیچ میں چھلانگ لگا دی۔ نیچے گرتے ہی انھوں نے پاؤڈر چھڑک دیا۔ ایک سیکنڈ کے اندر اندر چیونٹے ہلاک ہو گئے۔ پھر لالہ غنی دیوار سے لگ گئے، اتنی دیر میں میں بھی منڈیر پر کھڑا ہو چکا تھا۔ میں نے بھی آنکھیں بند کر کے چھلانگ لگا دی۔ چاروں تبتی جا چکے تھے۔

چند منٹ تک ہم کنویں میں پڑے رہے۔ پھر وہی تبتی لالہ غنی کا منہ بولا بھائی، آیا۔ اس نے ایک رسا منڈیر سے کس کر باندھ دیا اور اس کا سرا کنویں میں لٹکا کر واپس چلا گیا۔ باری باری ہم دونوں اس رسے کی مدد سے کنویں سے باہر آ گئے۔ ہم اب واپس اسی جگہ آنا چاہتے تھے کہ ہمیں چند تبتیوں نے دیکھ لیا۔ ان کے پاس خوں خوار کتے تھے۔ انھوں نے ہمارے پیچھے کتے چھوڑ دیے۔ ہم بھاگ کر ایک تنگ سی گلی میں جا نکلے۔ اس گلی کا راستہ آگے سے بند تھا۔ کتے ہمارے قریب آ چکے تھے۔ ہم حیران تھے کہ کیا کیا جائے۔ اتنے میں دائیں ہاتھ کے مکان کا دروازہ کھلا۔ ہم نے موقع غنیمت جانا اور چھلانگ لگا کر دروازے میں داخل ہو گئے۔ ہم نے دروازہ بند کر لیا مگر کتے ہمارے اتنے قریب پہنچ چکے تھے کہ ایک کتے کی گردن دروازے کے دونوں پٹوں کے درمیان آ گئی۔ ہم نے زور لگا کر دروازہ بند کر دیا اور اندر کی طرف سے کنڈی لگا لی۔ کتا وہیں پھنس کر رہ گیا اور دم گھٹنے سے ہلاک ہو گیا۔

بعد میں ہمیں پتا چلا کہ دروازہ کھولنے والا ایک بوڑھا تبتی تھا جسے نیند کی حالت میں چلنے پھرنے کی عادت تھی۔ وہ اس وقت سوتے سوتے اٹھا تھا اور دروازے تک آ کر اسے کھولنے لگا تھا کہ عین اسی وقت ہم وہاں پہنچ گئے۔

”اس بڈھے تبتی نے آپ کو کچھ نہیں کہا؟“ بلال نے پوچھا۔

”وہ ہمیں کیا کہہ سکتا تھا۔ پھر وہ تو سویا ہوا تھا۔ خواب میں چل رہا تھا۔ جب ہم اندر داخل ہوئے اور دروازہ بند کیا تو وہ مکان کی سیڑھیوں میں ہی سو گیا۔

ہم سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر آ گئے۔ وہاں ہم نے دیکھا کہ شیشے کے ایک بہت بڑے ڈبے میں دو مرتبان ہیں جن میں زہر کے چھتے لگے ہیں۔“

”زہر کے چھتے یا شہد کے چھتے؟“ چاچی نے پوچھا۔

”زہر کے چھتے...... سنیے تو......“ آصف نے کہا۔ ”ان چھتوں میں شہد کی بجائے زہر کی مکھیاں تھیں۔ یہ مکھیاں دراصل اس بوڑھے نے چنگ فرنگ کے حکم سے پال رکھی تھیں۔ ان مکھیوں کا زہر انتہائی خطرناک ہوتا ہے اور ان کا کاٹا دوسرا سانس بھی نہیں لیتا۔“

”تمھیں اس کا کیسے پتا چلا؟“ ندیم نے پوچھا۔

”بات یہ ہوئی۔“ آصف بولا۔ ”کہ لالہ غنی کو ایک تجویز سوجھی۔ ہم چھت سے پھر نیچے آ گئے۔ بوڑھا ابھی تک سیڑھیوں میں لیٹا خواب میں اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا۔ لالہ غنی نے
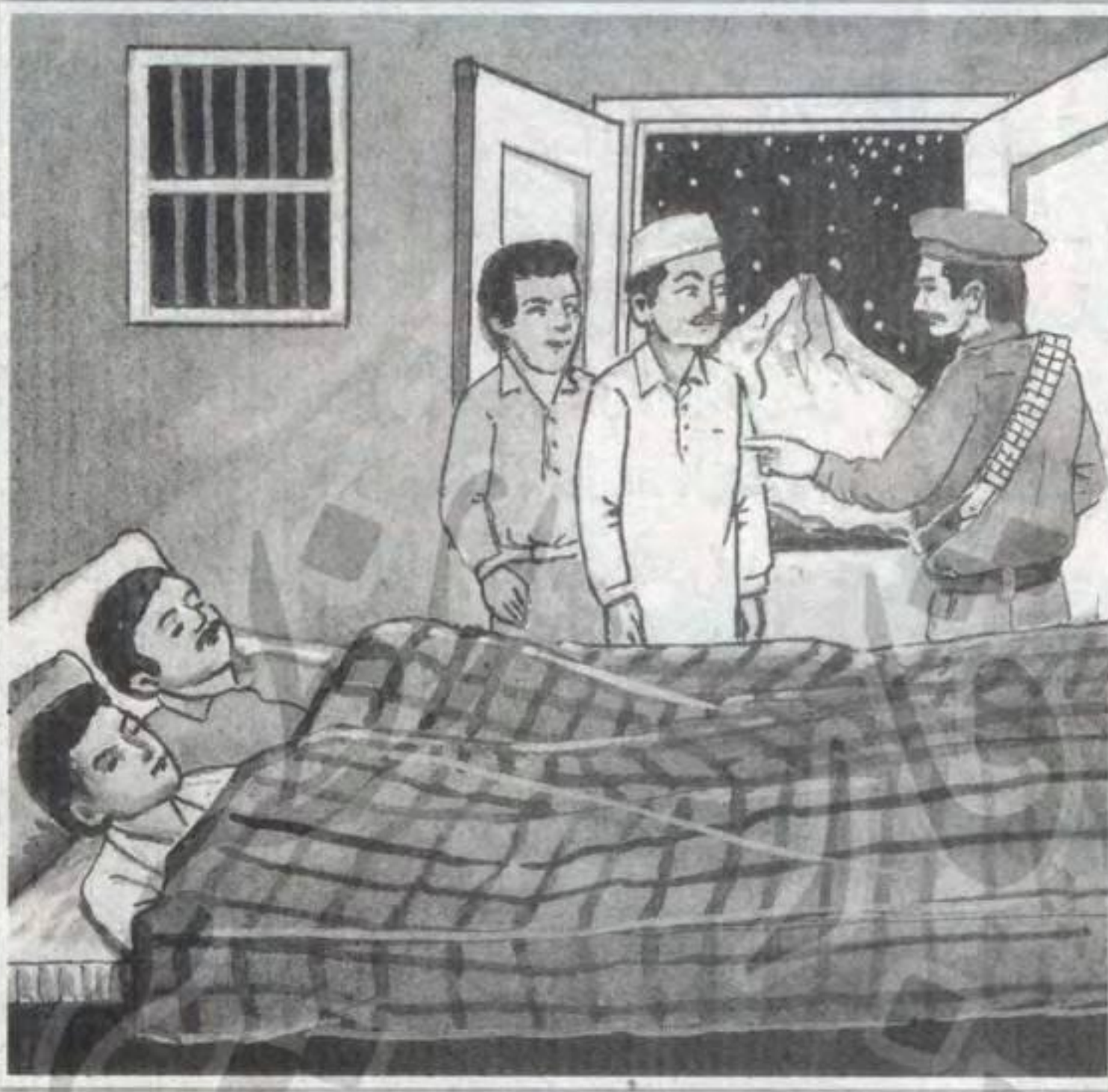
اس سے باتیں کرنا شروع کر دیں اور بہت سی راز کی باتیں معلوم کر لیں۔ اسی سے ہمیں پتا چلا کہ یہ مکھیاں آگ سے ڈرتی ہیں۔ اسی بوڑھے کی زبانی معلوم ہوا کہ چنگ فرنگ کا منصوبہ ہے کہ جب وہ ساری دُنیا کو تباہ کرنے کے لیے حملے کرے گا تو موت کی شعاعوں کے علاوہ ان مکھیوں سے بھی کام لے گا۔''

لالہ غنی نے بڈھے سے پوچھا کہ اگر یہ مکھیاں کسی کو کاٹ لیں تو اس کا علاج کیا ہے۔ بڈھے نے بتایا کہ ان مکھیوں کے کاٹے کا علاج اس کے سوا دُنیا میں اور کسی کے پاس نہیں۔ لالہ غنی کے دریافت کرنے پر اس نے بتایا کہ برابر والے کمرے میں ایک شیشی ہے جس میں وہ پچاس برس سے ان مکھیوں کے جسم کا عرق نچوڑ کر جمع کرتا رہا ہے۔ اس عرق کا ایک قطرہ لگا دینے سے ان مکھیوں کا زہر بے کار ہو جاتا ہے۔

''کہاں ہے وہ شیشی؟'' ندیم نے پوچھا۔

''لالہ غنی کے پاس۔'' آصف بولا۔ ''پھر ہم نے اس کمرے میں سے دو کمبل اٹھائے اور اپنے جسم کے اردگرد اچھی طرح لپیٹ کر چھت پر آ گئے۔ ایک مرتبان میں نے اور دوسرا مرتبان لالہ غنی نے اٹھا لیا۔ ان کے اندر لاکھوں مکھیاں بند ہیں۔'' یہ کہہ کر آصف نے مرتبان ان کو دکھائے۔ آصف نے بات جاری رکھی۔

''پھر ہم چھت سے نیچے آئے۔ اتنی دیر میں تبتی ہمارا پیچھا کرتے ہوئے وہاں پہنچ چکے تھے اور اب دروازہ کھٹکھٹا رہے تھے۔ جب بوڑھے نے دروازہ نہ کھولا تو وہ دروازہ توڑ کر اندر داخل ہو گئے۔ بوڑھا ابھی تک سیڑھیوں میں سویا ہوا تھا۔ ہم ایک کمرے میں چھپے ہوئے تھے۔ اندر آتے ہی انھوں نے بوڑھے کے ٹھوکریں مارنا شروع کر دیں۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ تلاش کرتے ہوئے اس کمرے میں آ گئے جہاں ہم دونوں کمبلوں میں لپٹے بیٹھے تھے۔ جب وہ ہمارے قریب پہنچے تو لالہ غنی نے اپنے مرتبان کا ڈھکن تھوڑا سا کھول دیا۔

اس میں سے چند مکھیاں بھنبھناتی ہوئی نکلیں اور ان لوگوں پر ٹوٹ پڑیں۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ زمین پر تڑپ تڑپ کر مر گئے۔ مرتے وقت پہلے تو ان کا جسم سرخ ہوا۔ پھر انھیں خون کی قے آئی اور اس کے بعد وہ ختم ہو گئے۔

ہم نے اپنے اوپر کمبل ڈالے ہوئے تھے اس لیے بچ گئے۔ یہ مکھیاں کمرے میں سے نکل کر اردگرد کے علاقے میں پھیل گئیں اور انھوں نے سینکڑوں تبتیوں کو ہلاک کر دیا۔ اب ہم اس مکان سے نکلے اور چھپتے چھپاتے واپس آ گئے۔''

''راستے میں آپ کو کوئی اور تبتی نہیں ملا۔'' بلال نے پوچھا۔

''چند ایک ملے مگر ہم ہر مرتبہ مرتبان سے ایک دو مکھیاں نکال دیتے تھے۔ یہاں سے تھوڑی دُور ہمارے پیچھے کوئی ایک سو تبتی بھاگے آ رہے تھے۔ ابھی ہم نے مرتبان میں سے چند ایک ہی مکھیاں نکالی تھیں کہ ان لوگوں کی لاشیں زمین پر تڑپنے لگیں۔ صرف ایک شخص بچ سکا جو اس وقت سگار پی رہا تھا۔ ان لوگوں کو ختم کرنے کے بعد یہ مکھیاں ہمارے پیچھے پڑ گئیں۔ ہم کمبل اوڑھے ہوئے تھے، اس لیے بچ گئے مگر انھوں نے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا۔ آپ نے بروقت آگ جلا لی ورنہ ایک آدھ کی موت واقع ہو جاتی۔'' (باقی آئندہ)

وہ ایک خوب صورت مجسمہ تھا جو خان یوسف نے عبدالکریم کے پاس رکھوایا تھا۔ خان یوسف اکثر کاروبار کے سلسلے میں بیرون ممالک جاتے رہتے تھے۔ وہ جب بھی دورے سے لوٹتے تھے، ان کے پاس کوئی نہ کوئی پرانی چیز ہوتی تھی۔ نادر و نایاب چیزیں جمع کرنا ان کا شوق تھا۔ وہ مجسمہ بھی انہیں ہانگ کانگ سے ملا تھا۔ اس مجسمے کے بارے میں مشہور تھا کہ یہ دو ہزار سال پرانا ہے۔ امریکہ جاتے ہوئے وہ مجسمہ عبدالکریم کے پاس رکھ کر گئے تھے۔ اس کو بڑی حیرانی ہوئی تھی کہ اتنا قیمتی مجسمہ امانت کے طور پر اس کے پاس رکھ کر چلے گئے ہیں جب کہ یہ مجسمہ ان کو اپنے گھر پر رکھنا چاہیے تھا تاکہ وہاں وہ زیادہ محفوظ رہ سکے۔

خان یوسف کو گئے تین سال ہو گئے تھے، حالانکہ کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ وہ اتنا عرصہ لاہور سے دُور رہے ہوں۔ ان کی فیملی بھی ان کے جانے پر کراچی منتقل ہو گئی تھی۔ ان کی فیملی اتنی جلدی کراچی منتقل ہوئی تھی کہ وہ اس کو اپنا پتا اور ٹیلی فون نمبر بھی نہیں دے کر گئے تھے، ورنہ وہ ان سے رابطہ کر کے خان یوسف کی خیر خیریت ضرور معلوم کر لیتا۔

ان دنوں کاروباری حالات بڑے خراب چل رہے تھے۔ عبدالکریم کی دُکان پر روزانہ ہزاروں کی سیل ہوتی تھی۔ اب حالت یہ ہو گئی تھی کہ تین چار سو روپے کی جس دن سیل ہو جائے سمجھ لو بڑی بات ہے۔ ان کی دکان میں مال کی کمی ہو گئی تھی۔ اگر اس میں چار پانچ لاکھ کا مال اور آجاتا تو دُکان کی سیل میں پھر سے اضافہ ہو سکتا تھا۔ اتنا مال مارکیٹ سے اٹھانے کے لیے اسے کم از کم دو لاکھ روپے کی اشد ضرورت تھی۔ یہ رقم وہ ہول سیل مارکیٹ میں کسی بھی دُکان دار کو مجسمہ دے کر چار، پانچ لاکھ روپے کا مال لے سکتا تھا اور باقی رقم قسطوں میں ادا ہوتی رہتی۔

ایک دن اس کا پُرانا دوست ارسلان اس سے ملاقات کے لیے گھر آیا۔ اس کی بازار میں پرانی چیزیں خریدنے اور بیچنے کی دُکان تھی۔ وہ اس مجسمے کو دیکھ کر بُری طرح چونکا۔

”ارے اتنی قیمتی چیز تمہارے پاس ہے اور تم اس سے بالکل بھی فائدہ نہیں اٹھا رہے ہو۔“ اس نے کہا۔

”اس پتھر کے مجسمے سے مجھے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔“ عبدالکریم بولا۔

”یہ مجسمہ بڑا نایاب ہے میرے حساب سے یہ کم از کم 5 لاکھ روپے کا ہو گا۔ تم اس مجسمے کو بیچ کر رقم کو اپنے کاروبار میں لگا لو، تمہارا کاروبار چمک جائے گا۔“

''میں اس مجسمے کو نہیں بیچ سکتا۔ یہ کسی کی امانت ہے۔''
''جس کی یہ امانت ہے اس کو بھی اس کی قیمت کا اندازہ نہیں ورنہ وہ تمہارے پاس اس طرح سے اس مجسمے کو رکھ کر لینا نہیں بھولتا۔ کبھی تمہارا اس مجسمے کو بیچنے کا موڈ بن جائے تو میرے پاس ضرور آنا، میں تمہیں اس کی معقول رقم دے دوں گا۔''
''میں اس مجسمے کو کیسے بیچ دوں اگر خان یوسف آ گئے تو میں ان کو کیا جواب دوں گا۔'' عبدالکریم نے کہا۔
''کہہ دینا گھر میں چوری ہوگئی تھی چور سامان سمیت اس مجسمے کو بھی لے کر چلے گئے۔'' ارسلان نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''میں نے بُرے سے بُرے حالات میں بھی امانت میں خیانت نہیں کی۔'' عبدالکریم نے کہا۔
اس وقت عبدالکریم نے ارسلان کو ٹال دیا تھا لیکن اب اس کو ارسلان کی بات اچھی لگ رہی تھی، بیٹھے بٹھائے ٹھیک ٹھاک رقم مل جاتی اور اس کا کاروبار پھر سے چمک اٹھتا۔ خان یوسف کو ایک جھوٹی ایف آئی آر دکھا کر معاملہ صاف ہوسکتا تھا۔ پیسے میں بڑی کشش ہوتی ہے، پولیس پیسے لے کر آسانی سے چوری کا مقدمہ بنا سکتی ہے۔ اس خیال نے عبدالکریم کو مجسمہ بیچنے پر آمادہ کر دیا تھا۔
ارسلان نے عبدالکریم کو اپنی دُکان میں آتا دیکھ کر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔
''آؤ بھئی عبدالکریم کیسے حال چال ہیں تمہارے؟''
''اللہ تعالیٰ کا شکر ہے، میں بالکل خیریت سے ہوں۔ میں آپ کے پاس ایک ضروری کام سے آیا ہوں۔'' عبدالکریم نے کہا۔
''تمہارا آنا ہی اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تم وہ مجسمہ بیچنے کو تیار ہو گئے ہو۔'' ارسلان نے خالص کاروباری انداز میں اس کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا۔
''جج..... جی ہاں!'' عبدالکریم نے جھجکتے ہوئے کہا۔
''یہ تم نے بڑی عقل مندی کا ثبوت دیا ہے، خان یوسف کو تین سال ہو چکے ہیں تمہارے پاس آئے ہوئے، ہوسکتا ہے کہ اس کا انتقال ہو گیا ہو اور تم اس مجسمے کو نہ بیچ کر اس فائدے سے محروم ہو جاتے۔'' ارسلان کی آنکھوں میں اس وقت ایک خاص چمک سی آ گئی تھی۔ ''میں تم کو اس وقت ایک لاکھ روپے دے سکتا ہوں باقی رقم چار لاکھ روپے مجسمہ ملنے کے ایک ہفتے بعد ادا کروں گا۔''
اسی وقت ارسلان کی دُکان میں چند گاہک داخل ہوئے اور وہ ان کی طرف متوجہ ہو گیا اور ان سے بات چیت کرنے میں مصروف ہو گیا۔
''یہ تم کیا کر رہے ہو عبدالکریم، تم ایک امانت کی حفاظت نہ کر سکے اور اس کو بیچنے پر تل گئے ہو۔'' اس کی ضمیر نے جیسے سرگوشی کی۔
''ہزاروں لوگ دوسروں کی امانت ہڑپ کر جاتے ہیں، میں اپنے مستقبل کو بہتر بنانے کے لیے ایسا کر رہا ہوں تو کون سا بُرا کر رہا ہوں۔'' اس نے یہ کہتے ہوئے اپنے دل کی آواز کو دبا دیا۔
عبدالکریم کی نظر بے اختیار دُکان کی ایک دیوار پر لگے طغرہ پر پڑی۔
ترجمہ: بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں جن کی ہیں انہیں سپرد کرو۔ (پارہ نمبر 5، رکوع نمبر 5)
قرآنی آیت پڑھ کر عبدالکریم کو ایک جھٹکا سا لگا۔ خوف سے اس کے ماتھے پر پسینہ آ گیا، اس نے رومال نکال کر اپنی عرق آلود پیشانی خشک کی۔ اسے سخت ندامت کا احساس ہونے لگا کہ وہ ایک امانت کی حفاظت نہیں کر سکتا۔ شیطان کا کام ہی انسانوں کو بہکانا ہے وہ مختلف وسوسے انسان کے دل میں ڈال کر بھٹکاتا ہے۔
گاہکوں سے فارغ ہو کر ارسلان اس کی جانب متوجہ ہوا، سیف سے ایک لاکھ روپے کی گڈی نکال کر عبدالکریم کی طرف بڑھائی۔ ''یہ ایک لاکھ روپے ہیں، اچھی طرح سے گن لو۔''
''نن...... نن...... نہیں...... مم...... میں...... وہ مجسمہ نہیں بیچ سکتا۔'' عبدالکریم نے اپنا نوٹوں کی طرف بڑھا ہوا ہاتھ واپس کھینچ لیا۔
''ارے تم ان نوٹوں سے ایسے گھبرا رہے ہو جیسے یہ بچھو ہوں اور تمہیں ڈنگ مار دیں گے۔'' ارسلان نے کہا۔
''ہاں ہاں! یہ بظاہر نوٹ نظر آ رہے ہیں لیکن کل میری قبر میں یہ سانپ بچھو بن کر مجھے ڈنگ ماریں گے اور ڈسیں گے۔''
''عبدالکریم اتنی سی دیر میں کیا ہو گیا ہے، ابھی تم بالکل ٹھیک ٹھاک میرے پاس آئے تھے اور مجسمے کی بات کی، پھر یہ تمہیں کیا ہو گیا۔'' ارسلان ایک لمحے کو گھبرا سا گیا۔
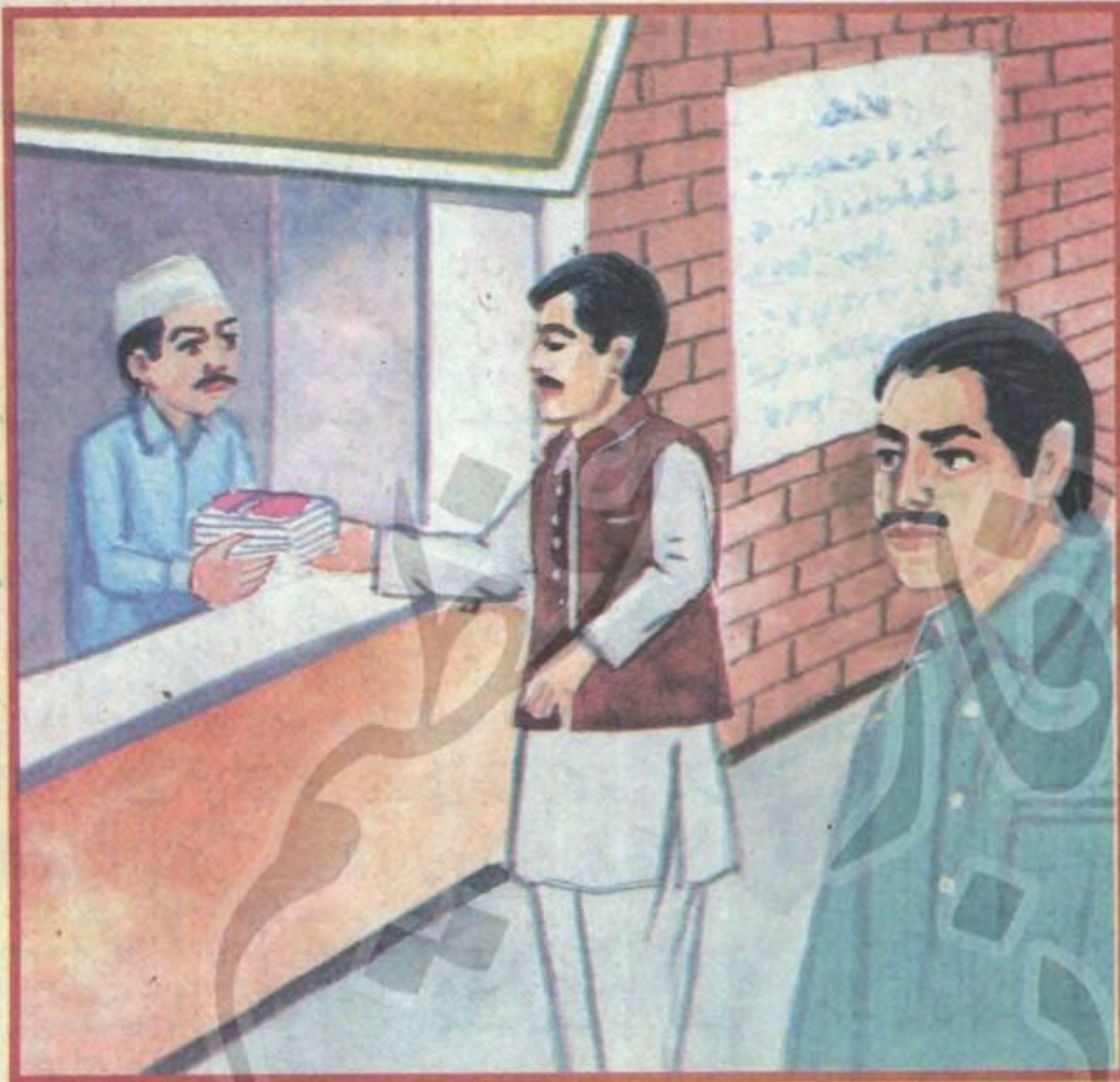
عبدالکریم نے اپنی انگلی سے دیوار پر لگے طغرہ کی طرف اشارہ کیا اور پھر بڑی تیزی سے دُکان سے باہر نکل گیا۔

ارسلان ہونقوں کی طرح عبدالکریم کو جاتا دیکھتا رہ گیا۔

ابھی اس واقعہ کو تین دن ہی گزرے تھے کہ خان یوسف کا پوتا جمال خان اس سے ملاقات کرنے کے لیے چلا آیا۔ اس کو دیکھ کر عبدالکریم کو بڑی خوشی ہوئی۔ خان جمال نے دورانِ گفتگو بتایا کہ ان کے دادا خان یوسف امریکہ سے واپسی پر ایسے بیمار پڑے کہ بستر کے ہو کر رہ گئے۔ تین ماہ قبل ان کا انتقال ہو گیا ہے۔ وہ مجسمہ لینے آیا ہے جو ان کے دادا جان نے امانت کے طور پر آپ کے پاس رکھوایا تھا۔ عبدالکریم نے وہ مجسمہ خان جمال کے حوالے کر دیا۔

''کیا تم اس مجسمے کو فروخت کرو گے؟'' عبدالکریم نے پوچھا۔

''نہیں ہم اس کو دادا جان کی یادگار کے طور پر گھر میں رکھیں گے۔ اس مجسمے کی مارکیٹ میں لاکھوں روپے کی قیمت ہے اور دادا جان کو اس وقت بہت سستا مل گیا تھا۔ ہمیں بڑی حیرت ہے کہ انہوں نے یہ اپنا قیمتی مجسمہ آپ کے پاس رکھوا دیا تھا۔'' خان جمال نے کہا۔

''یہ آپ لوگوں نے اس مجسمے کو یادگار کے طور پر رکھنے کا اچھا فیصلہ کیا۔ پیسے کا کیا ہے وہ آہستہ آہستہ ختم ہو جاتا ہے۔'' عبدالکریم نے کہا۔

دادا جان نے مرنے سے قبل آپ کے لیے یہ ایک لفافہ دیا تھا اور کہا تھا کہ عبدالکریم تمہیں جب وہ مجسمہ دے اس صورت میں اسے یہ لفافہ دے دینا۔ مجسمہ نہ دینے کی صورت میں لفافہ نہ دینا۔'' خان جمال نے کہا۔

عبدالکریم نے حیرت سے لفافے کو دیکھا۔ لفافے پر پلاسٹک ٹیپ اس طرح لگائی گئی تھی کہ کوئی اس کو آسانی سے نہ کھول سکے۔ اس نے خان جمال کے سامنے وہ لفافہ کھول کر دیکھنا مناسب نہ سمجھا اور لفافے کو ایک جانب رکھ دیا۔

خان جمال کے جانے پر اس نے لفافہ کھول کر دیکھا۔ لفافے میں 6 لاکھ روپے کا کراس چیک تھا اور اس میں ایک خط تھا۔ اس میں لکھا تھا۔

''جب تم کو یہ لفافہ ملے گا اس کو کھولنے پر تمہیں حیرت کا جھٹکا لگے گا اور تم میرے اس راز کو جان جاؤ گے جو میں زندگی بھر چھپاتا رہا ہوں۔ جب تمہیں یہ راز معلوم ہو جائے تو پھر اس کا راز ہی رکھنا۔ تم مجھ سے اکثر پوچھتے تھے کہ میں اتنا کماتا ہوں، بیرونِ ملک بھی جاتا ہوں لیکن میرے وہ شاہانہ ٹھاٹ باٹ نہیں جو باہر جا کر تجارت کرنے والے لوگوں کے ہوتے ہیں۔ دراصل اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے تجارت سے جو فائدہ ہوتا تھا، میں اس کے چار حصے کرتا تھا۔ ایک حصہ اپنے لیے، ایک بچوں کے لیے، باقی دو حصے میں کسی مستحق کے لیے رکھتا تھا۔ مستحق کا انتخاب میں اس طرح کرتا تھا کہ

کسی کو کوئی چیز دے کر آزماتا تھا۔ رقم کا بہتر استعمال وہ کر سکتا ہے جو امانت اور دیانت دار ہو۔ ایسے شخص کی اگر مدد کی جائے تو وہ اس مدد کا پورا فائدہ اٹھاتا ہے اور آئی ہوئی رقم کو ضائع نہیں کرتا۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ دیکھ بھال کر اگر کسی کی مدد نہ کی جائے تو وہ رقم ضائع ہو جاتی ہے اور پھر اس شخص کی بھی عادت خراب ہو جاتی ہے اور پھر وہ دوسرے لوگوں سے قسم قسم کے بہانے تراش کر رقمیں بٹورتا ہے اور ہڈ حرامی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ مختلف بہانوں سے آئی رقم اس کے کسی کام نہیں آتی اور وہ فقیر کا فقیر رہتا ہے۔ میں نے جس کو بھی رقم دی اس کا بالکل درست استعمال ہوا اور وہ لوگ مستحکم ہو کر اب دوسروں کی مدد کر رہے ہیں۔ تمہاری حالت مجھ سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ میں سب جانتا ہوں کہ تمہارا کاروبار اتنا اچھا نہیں رہا۔ ہاں! اگر اس کاروبار میں کچھ رقم اور لگ جائے تو تمہارا کاروبار پھر سے چمک سکتا ہے۔ بحیثیت دوست کے بیٹے کے میں تمہاری مدد کر سکتا تھا لیکن میرے دل نے یہ گوارا نہ کیا کہ تمہیں بغیر آزمائے رقم دوں۔ جو طریقہ کار سب کے لیے میں نے اپنایا تھا وہی تمہارے ساتھ بھی کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ مجسمہ بہت قیمتی ہے، جس کے پاس بھی ہوگا اس کی نیت خراب ہو جائے گی۔ یہی سوچ کر میں نے تمہارے پاس وہ مجسمہ رکھا تھا کہ تم جس نیت سے مجھ سے رقم لینا چاہو گے تمہیں ملے گی۔ مجسمہ بیچے بغیر بھی رقم ملے گی اور مجسمہ بیچ کر بھی رقم ملے گی لیکن مجسمہ بیچ کر تم دیانت دار نہ رہ سکو گے۔ میرے خط کی تمہارے ہاتھ میں موجودگی یہ بات ثابت کر رہی ہے کہ تم واقعی دیانت دار ہو اور ہاں جب کبھی تم مالی طور پر مستحکم ہو جاؤ اور تمہارے دل میں بات آئے کہ مجھے یہ رقم واپس کر دینی چاہیے تو تم یہ رقم میرے بچوں کو ہرگز مت دینا بلکہ اپنے ہی جیسے کسی شخص کو جو مدد کا مستحق ہو، دے دینا لیکن آزما کر دینا تاکہ رقم کا درست استعمال ہو۔ ہماری نیکی سفر کرتی رہے، یہی ہمارے حق میں سب سے زیادہ بہتر ہے۔

تمہارا انکل

خان یوسف

خط پڑھ کر بے اختیار عبدالکریم کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ وہ جان گیا تھا کہ واقعی خان یوسف عظیم آدمی تھے۔ وہ بستر مرگ پر بھی پڑے ہوئے اپنے ذرائع سے اس کے حالات سے آگاہ رہے اور اپنے اصول کو بھی نہیں توڑا تھا۔ وہ اپنے دل میں یہ عہد کر چکا تھا کہ وہ خان یوسف کے اس نیکی کے سفر کو زندہ رکھے گا۔ ان کی یہ نیکی جاری رہے گی۔

سلسلہ کھوج لگایئے میں حصہ لینے والے بچوں کے نام

سہل زاہرہ، شیخوپورہ۔ ثمر خان، بھکر۔ محمد مجیر خان، گوجرانوالہ۔ مسفرہ عاتکہ فاروق، شام کوٹ۔ انصر علی، وہاڑی۔ حفصہ نور، گوجرانوالہ۔ وزاہادی بیگ، حیدر آباد۔ محمد عثمان خالد، لاہور۔ عشاء سعید، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ محمد ہمایوں طارق، ملتان۔ طٰہٰ عبداللہ، گوجرانوالہ۔ محمد تیمور ذوالفقار، لاہور کینٹ۔ طیب خالد، لاہور۔ شہزادی خدیجہ، لاہور۔ بنت مسعود احمد، لاہور۔ محمد ابراہیم، لاہور۔ محمد حبیب اللہ، لاہور۔ انیس الرحمن، گوجرانوالہ کینٹ۔ محمد عمر سعد، کوہاٹ۔ آمنہ ارشد، ٹیکسلا۔ سلیمان علی اعوان، راول پنڈی۔ زین العابدین، گوجرہ۔ مدحت حامد، واہ کینٹ۔ ماہ نور ارشد، گوجرہ۔ سیف اللہ، قصور۔ محمد حمزہ مقصود، لاہور۔ زینب کامران، سرگودھا۔ عروج نوید، لاہور۔ ماہ رخ ناصر، سرگودھا۔ حمزہ اظہر، لاہور۔ عبداللہ انور، راول پنڈی۔ محمد اسامہ وحید، ہری پور۔ محمد عمیس، بھکر۔ محمد منیب انجم، قصور۔ ولید اشرف، گوجرہ۔ محمد حمزہ سعید، بورے والا۔ گلشن اسلم، میر پور آزاد کشمیر۔ راجہ محمد عمیر، راول پنڈی۔ احمد نسیم، ایبٹ آباد۔ علی طاہر، لاہور۔ سیدہ ماہم گفتار، واہ کینٹ۔ ثناء رانی، گجرات۔ رہی شہباز، کرک۔ راجہ عظمت حیات، جہلم۔ شرجیل مختار۔ عائشہ شہباز، بورے والا۔ حمد اللہ، مردان۔ بلال احمد قریشی، میاں والی۔ فاران شاہد، لاہور۔ اسامہ خٹک، پشاور۔ حسیب بدر، بورے والا۔ محمد اویس نصیر، راول پنڈی۔ محمد حسان رضا خان، واہ کینٹ۔ محمد معاذ شاہ، کراچی۔ حسان بدر، بورے والا۔

ہاکی کے کھیل کی ابتداء کیسے ہوئی؟

نسرین شاہین

ہاکی پاکستان کا قومی کھیل ہے۔ ہاکی اسٹک اور گیند سے کھیلا جانے والا دُنیا کا سب سے قدیم کھیل ہے۔ اس کی ابتداء کیسے ہوئی اور یہ کھیل کب اور کہاں شروع ہوا، اس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے۔ ایک جانب یہ خیال ہے کہ اس شہرہ آفاق کھیل کی ابتداء گڈریے کی چھڑی سے ہوئی جو اپنی بھیڑ بکریاں چراتے ہوئے راستے کے پتھروں کو اپنی چھڑی سے اِدھر اُدھر ٹھوکریں مارتا تھا۔ چنانچہ اس طرح ہاکی جیسا کھیل ایجاد ہوا۔ ایک طویل عرصہ تک یہ خیال کیا جاتا رہا کہ ہاکی پولو کھیل کی ایک شکل ہے، جس کے آثار بیسویں صدی کے آغاز میں وادیٔ نیل کے مقام Beni Hassan کے قریب ملے۔ کھدائی کے دوران کچھ مقبرے دریافت ہوئے۔ ان میں سے ایک مقبرے کی دیوار پر دو آدمی دکھائے گئے جن کے ہاتھوں میں ایک طرف سے مڑے ہوئے لمبے ڈنڈے یعنی اسٹکس تھیں جو ہاکی اسٹک سے مشابہ تھیں اور جنگِ عظیم اوّل سے قبل استعمال کئے جاتے تھے۔ ان مڑی ہوئی چھڑیوں کے درمیان ایک گول سی چیز گیند کی طرح موجود تھی اور دو آدمی اس طرح کھڑے تھے جیسے Bully کے وقت ہاکی میں کھلاڑی کھڑے ہوتے ہیں۔

متذکرہ تصاویر سے کچھ حد تک اس کے قدیم ہونے کے ثبوت ظاہر ہوتے ہیں۔ عزم و ہمت اور استقلال سے کھیلا جانے والا یہ کھیل جس پر دُنیا کے تمام مؤرخ متفق ہیں کہ یہ ایک قدیم کھیل ہے جس کی ابتداء تاریخ کی تاریکی میں کہیں گم ہو چکی ہے لیکن آج بھی وقتاً فوقتاً کچھ ثبوت اور شہادتیں سامنے آتی ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آج کا مقبول کھیل ہاکی دو ہزار سال قبل مسیح فارس موجودہ ایران میں کھیلا جاتا تھا۔ پھر یہ کھیل ایران سے یونان پہنچا۔ ماہرین آثارِ قدیمہ کا کہنا ہے کہ تقریباً ڈیڑھ ہزار سال قبل ہاکی جیسا کھیل ایتھنز (Athens) کے لوگوں میں عام تھا لیکن قدیم ہاکی نما یہ کھیل آج کی ہاکی سے تھوڑا مختلف تھا۔ یہ بات تو سب ہی جانتے ہیں کہ ہاکی اسٹک کا نچلا سرا خم دار ہوتا ہے اور یہ خم نیچے سے اوپر کی طرف ہوتا ہے، اس کے برخلاف قدیم یونانی ہاکی اسٹک کا نچلا سرا اوپر سے نیچے کی جانب رکھا جاتا تھا۔ عیسوی صدی

کے آغاز سے پہلے ہاکی جیسا کھیل شمالی امریکہ کے قبائل میں خاصا مقبول تھا بلکہ اسی دور میں ہاکی سے ملتا جلتا کھیل آئرلینڈ، اسکاٹ لینڈ اور انگلستان میں بھی کھیلا جاتا تھا بلکہ روم میں Pagnica نامی کھیل جو کہ ہاکی سے ملتا جلتا ہے، کھیلا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ میکسیکو کے باشندوں میں بھی اس طرح کے کھیل کا پتا چلتا ہے لیکن ہاکی کے کھیل کا سب سے اہم ثبوت یونان کے دارالحکومت ایتھنز میں ایک دیوار سے ملتا ہے جو وہاں کے باشندوں نے سمندر کے پانی کو روکنے کے لیے بنائی تھی۔

اس دیوار پر بہت سی تصویریں کندہ کی گئی تھیں۔ ان میں سے ایک تصویر ایسی بھی ہے جن میں کچھ لوگ ہاکی سے ملتا جلتا کھیل کھیل رہے ہیں۔ یہ ثبوت 1922ء میں کھدائی کے دوران منظر عام پر آئے۔ کہتے ہیں کہ اس دیوار کو تھیمستوکلیز نے 478 قبل مسیح میں تعمیر کروایا تھا جب کہ 1272 قبل مسیح ہاکی کی طرح کھیلا جانے والا آئرلینڈ کا قومی کھیل Hurling کے آثار بھی ملتے ہیں۔ ابتدائی دور میں فٹ بال کی طرح ہاکی کھیل بھی بہت غیر مہذب ہوا کرتا تھا جس میں کھلاڑی ایک دوسرے کو زخمی کرنے یا ہاتھ پیر توڑنے سے بھی گریز نہیں کیا کرتے تھے۔ بعض اوقات کھلاڑی زندگی بھر کے لیے اپنی زندگیوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے تھے۔ اس ضمن میں آئرلینڈ کے ولی عہد رول ریڈلوئن شے کا واقعہ بہت ہی مشہور ہے جو حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے چند برس پہلے کا ہے۔ مذکورہ شہزادہ آئرلینڈ کے تخت و تاج کا واحد وارث تھا جو کہ ہاکی کھیل کا نہایت شوقین کھلاڑی تھا۔ قسمت کی ستم ظریفی سے وہ پیدائشی طور پر گونگا بھی تھا۔ شہزادے کے والدین کے علاوہ اہلیان دربار بھی اس کی طرف سے بے حد فکر مند رہا کرتے تھے۔ بے شمار معالجوں اور جادوگروں کو دکھانے کے باوجود اس کا یہ گونگا پن دُور نہ ہو سکا۔ پھر ایک دن اچانک ہاکی کھیلتے ہوئے کسی کھلاڑی نے شہزادے کے ٹخنوں پر اس زور سے ہاکی رسید کی کہ شہزادے کی چیخ نکل پڑی اور اسی دن سے شہزادے کا گونگا پن بھی جاتا رہا اور وہ ٹھیک ہو گیا۔

مذکورہ بالا قصے کی صداقت سے قطع نظر یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہاکی اسکاٹ لینڈ میں Shinty، آئرلینڈ میں Hurling، انگلستان میں Bandy کے نام سے مشہور تھا جب کہ فرانس میں یہ کھیل Hoque کے نام سے مشہور تھا۔ دراصل فرانسیسی زبان میں "ہاکے" چرواہے کی چھڑی کو کہتے ہیں جس سے چرواہے بھیڑ بکریوں کو ہانکنے کا کام لیا کرتے تھے اور راستے کے پتھروں کو گیند کی طرح مارتے رہتے تھے۔ فرانسیسی زبان کا یہ لفظ جب انگریزی زبان میں داخل ہوا، تب سے یہ Hoque کے بجائے ہاکی کہلانے لگا۔ انگلینڈ کے علاوہ کئی یورپی ممالک میں اس کو ناپسند کیا جاتا تھا کیوں کہ اسی دور میں عام انسان کی زندگی میں تیغ زنی اور تیراندازی کو ہی مردانہ کھیل تصور کیا جاتا تھا جب کہ ہاکی جیسے کھیل غیر مفید قرار دیے جاتے تھے۔ اس خیال کے پیشِ نظر انگلستان کے شاہ ایڈورڈ سوم (77-1327ء) نے ہاکی کے کھیل پر پابندی عائد کر دی اور حکم کی خلاف ورزی کرنے والے کو جرمانے اور قید کی سزا بھگتنی پڑتی تھی۔ اس سخت قانون کے باوجود عام شخص کو اس کھیل کو کھیلنے سے نہ روکا جا سکا۔

چودھویں اور پندرھویں صدی میں ہاکی کے کھیل کو فروغ ملا اور انیسویں صدی میں ہاکی نے جدید ہاکی کی شکل اختیار کر لی۔ ہاکی کا پہلا کلب جنوب مشرقی لندن میں Black Heath کے مقام پر 1881ء میں قائم ہوا جب کہ 1883ء میں ویمبلڈن کلب کی بنیاد رکھی گئی۔ پھر 18 جنوری 1883ء کو لندن ہاکی ایسوسی ایشن نے وجود میں آتے ہی ہاکی کے رہنما اصول، قواعد و ضوابط بنائے۔ اس کھیل کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے 1900ء میں انٹرنیشنل ہاکی بورڈ وجود میں آیا لیکن ابتدائی اراکین میں صرف انگلینڈ، آئرلینڈ اور اسکاٹ لینڈ اور ویلز شامل تھے۔ 1871ء میں مغربی لندن میں ٹیڈنگٹن (Teddington) کے نام سے ہاکی کلب کا قیام ہوا جب کہ یہ پہلے سے کرکٹ کلب تھا۔ پہلے یہ عام خیال تھا کہ ہاکی کو موسم سرما کے کھیل کے طور پر کھیلا جائے گا تا کہ کلب کے کھلاڑی سردیوں کے موسم میں مناسب ورزشیں کر سکیں۔ بہر حال انگلستان میں ایک عرصہ تک ہاکی کو سردیوں کے کھیل کے طور پر کھیلا گیا۔ ٹیڈنگٹن کرکٹ کلب نے کرکٹ کی گیند کے ساتھ ہاکی کھیلی۔ غالباً یہ پہلا موقع تھا جب اسٹک اور گیند سے کھیلے

جانے والے کھیل میں ایسی گیند استعمال کی گئی جو بآسانی ایک سمت سے دوسری سمت میں حرکت کر رہی تھی۔ ٹیڈنگٹن کلب نے سب سے پہلے گول کے سامنے دائرے کو روشناس کرایا۔

1887ء میں ہاکی کا پہلا کاؤنٹی میچ سرے اور مڈل سیکس کے مابین کھیلا گیا جب کہ پہلا بین الاقوامی ہاکی میچ انگلینڈ اور آئرلینڈ کے مابین رچمنڈ میں کھیلا گیا اور خواتین میں ہاکی کھیلنے کی ابتداء کیمبرج، آکسفورڈ اور ڈبلن سے ہوئی اور اس طرح خواتین کی ہاکی کا پہلا میچ 1887ء کو آکسفورڈ میں کھیلا گیا اور ساتھ ساتھ انگلینڈ میں ہاکی کو خواتین کا قومی کھیل بنا دیا گیا۔ انگریزوں کے شوق نے ہاکی کو 1900ء کے پیرس اولمپک کھیلوں میں شامل کرایا۔ ہندوستان کی سرزمین پر ہاکی کا کھیل انگریز فوجیوں کے توسط سے پہنچا۔ ہاکی کی بڑھتی ہوئی شہرت نے پیرس میں ہاکی کا ایک عالمی ادارہ، فیڈریشن انٹرنیشنل ڈی ہاکی کا وجود جنوری 1924ء کو عمل میں آیا جب کہ انڈیا ہاکی فیڈریشن کا قیام 1925ء اور پاکستان اولمپک ایسوسی ایشن کا قیام پاکستان کے بعد 1948ء کو عمل میں آیا جس کے پہلے صدر سردار عبدالرب نشتر اور ہاکی فیڈریشن آف پاکستان کے پہلے صدر راجہ غضنفر علی خان تھے۔ 1948ء میں 14 ویں اولمپک لندن میں نوزائیدہ پاکستان نے ہاکی کے اس اولمپک مقابلے میں کرنل علی اقتدار شاہ دارا کی سربراہی میں شرکت کی اور چوتھی پوزیشن حاصل کی۔ ہاکی کے کھیل میں پاکستان تین بار اولمپک چیمپئن اور چار مرتبہ ورلڈ کپ کا فاتح رہا ہے۔ پاکستان کا شمار اب بھی دُنیا کی چار بہترین ٹیموں میں ہوتا ہے۔

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

حضرت امام حسینؓ

حضرت امام حسینؓ (۴ ہجری یا ۶۲۶ء...... ۶۱ ہجری ۶۸۰ء) حضرت علیؓ اور حضرت فاطمۃ الزہراؓ کے فرزند تھے۔ حضرت حسنؓ کے چھوٹے بھائی اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے تھے۔ حضرت علیؓ کی شہادت اور حضرت امام حسنؓ کی خلافت سے دست برداری کے بعد حضرت حسنؓ کی معیت میں مدینہ آ گئے۔ امیر معاویہؓ کی وفات کے بعد جب اموی خلافت کی زمام اقتدار یزید بن معاویہؓ کے ہاتھ میں آئی تو اسؓ نے مدینہ کے گورنر ولید ابن عقبہ کے ذریعے بہ زور اہل بیت اور دیگر صحابہؓ سے بیعت کا تقاضا کیا۔ حضرت امام حسینؓ اہل کوفہ کی دعوت پر عراق روانہ ہوئے لیکن اہل کوفہ نے بدعہدی کی اور عبیداللہ ابن زیاد کے ورغلانے پر امام حسینؓ کی حمایت چھوڑ کر یزید کی فوج کا ساتھ دیا۔ یزیدی افواج کی تعداد چار ہزار تھی جو عمرو بن سعد، شمر ذی الجوشن اور حر بن یزید تمیمی کے ماتحت تھے۔ امام حسینؓ کے ساتھ صرف اہل بیت کے بہتر افراد تھے۔

حضرت امام حسینؓ نے اتمام حجت کے طور پر بیعت یزید کے سوا صلح کے لیے مختلف شرائط پیش کیں لیکن یزیدی سرداروں نے سب شرائط مسترد کرتے ہوئے ایک ہی تقاضا جاری رکھا کہ یا تو امام بیعت یزید کریں یا سر دیں۔ جب جنگ ناگزیر ہو گئی تو حضرت امام حسینؓ اپنے بہتر جانثاروں کے ساتھ مقابلے کو نکلے۔ 10 محرم الحرام کو کربلا کے میدان میں دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں۔ امام عالی مقام کے ساتھی بڑی بے جگری سے لڑے مگر چار ہزار مسلح لشکریوں کے سامنے بہتر آدمیوں کی مختصر سی جماعت کیا حیثیت رکھتی تھی۔ تھوڑے ہی عرصے میں حضرت امام حسینؓ اور ان کے سب جان باز شہید ہو گئے۔ حضرت امام حسینؓ کا سر تن سے جدا کر کے اور نیزے پر چڑھا کر حرم اہل بیت کے ہمراہ یزید کے پاس روانہ کر دیا گیا۔ سانحہ کربلا میں علی بن حسین (زین العابدین) کے سوا جو اس وقت بیمار اور دس برس کے بچے تھے، اہل بیت کے سب مرد کام آئے۔ شہدا میں حضرت امام حسینؓ کے بھائی عباس، جواں سال بیٹا علی اکبر، شیر خوار بچہ علی اصغر اور افواج یزید کا ایک سردار حر (جو حضرت امام حسینؓ سے آملا تھا) شامل تھے۔ سانحہ کربلا نے عالم اسلام میں رنج والم کی ایک لہر دوڑا دی اور بنی امیہ کے خلاف نفرت کا ایک جذبہ پیدا ہو گیا۔ انہی جذبات نے پرورش پا کر خراسان میں بغاوت کی صورت اختیار کر لی جس نے ۶۱ ہجری میں بنی امیہ کے اقتدار کی شمع گل کر دی۔ حضرت امام حسینؓ کا مزار کربلا میں مرجع خلائق ہے۔ اس واقعہ کی یاد میں شیعہ یوم عاشور مناتے ہیں۔

اس تصویر کا اچھا سا عنوان تجویز کیجئے اور 500 روپے کی کتب لیجئے۔
عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 10/ دسمبر 2013ء ہے۔

نومبر 2013ء کے "بلاعنوان کارٹون" کے لیے جو عنوانات موصول ہوئے، اُن میں سے مجلسِ ادارت کو جو عنوانات پسند آئے، اُن عنوانات میں سے یہ ساتھی بہ ذریعہ قرعہ اندازی 500 روپے کی انعامی کتب کے حق دار قرار پائے۔

- پہلے بچے کو چپ کراؤ، بعد میں نیند کے مزے اڑاؤ۔ (زویا طارق، لاہور کینٹ)
- منے نے شور مچایا، سارا آسمان سر پر اٹھایا۔ (رابعہ سلیم، فیصل آباد)
- اماں ابا سوئیں بیزار، بچہ روئے زار و قطار۔ (محمد ابراہیم خاور، اٹک کینٹ)
- سونے کے انداز نرالے، دل کو بھائے تو فوراً اپنا لے۔ (حمنہ قندیل، ٹوبہ ٹیک سنگھ)
- مجھ سے کھیلو دن ہو یا رات، ممی پاپا سنو میری بات۔ (مدنی عابد، ملتان)
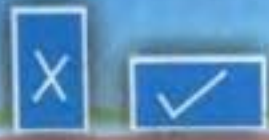
ہونہار مصور

شیرنی اور اس کے بچے

تصاویر صرف افقی رخ میں ہی بنائیں۔

ماہین زاہد، صادق آباد (پہلا انعام: 175 روپے کی کتب)

یسرا جوہر، میاں والی (دوسرا انعام: 150 روپے کی کتب)

صباء عارف، ڈجکوٹ (تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)

صدام حسین، صادق آباد (چوتھا انعام: 100 روپے کی کتب)

اقصیٰ شہزادی، گجرات (پانچواں انعام: 90 روپے کی کتب)

محمد اسامہ سعید، ٹوبہ ٹیک سنگھ (چھٹا انعام: 75 روپے کی کتب)

کچھ اچھے مصوروں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی: محمد صبغت اللہ لاشاری، کہوٹہ۔ ذوالقرنین شاہ، خان پور۔ سید زین العابدین شاہ، خان پور۔ عظمیٰ شہزادی، گجرات۔ محمد زین عظمت، گوجرانوالہ۔ سلیمان علی اعوان، راول پنڈی۔ محمد عماذ، لاہور۔ شانزہ اقبال، سرگودھا۔ ہانیہ محمود، شاہ پور۔ آمنہ کامران، سرگودھا۔ ماہ رخ ناصر، سرگودھا۔ عشاء سعید، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ محمد عبداللہ لطیف، مریدکے۔ شفق فاطمہ، راول پنڈی۔ فرحان شاہد۔ رحما ضیاء، اسلام آباد۔ صفا رشید، کراچی۔ شاذل مرتضیٰ، رحیم یار خان۔ اجوہ باجوہ، طاہر محمود ملک، الباب جعفر، مریم باجوہ، سلیم طاہر، عفیفہ خلیل، ایمن سجاد، محمد منیب احمد، عبدالحق، صادق آباد۔ عبدالرشید، گجرات۔ نوشابہ افروز، پشاور۔ عبداللہ بلوچ، خان پور۔ عبدالعزیز، بھکر۔ عذرا یاسمین، اوکاڑہ۔ تنویر احمد ساہی وال۔ محمد صدیق، جہلم۔ اشتیاق احمد خان، حیدر آباد۔ آصف اقبال، شیخوپورہ۔ محبوب فاطمہ، صوابی۔ نسیم افضل، لاہور۔ سعید اشرف، بہاول پور۔ ☆☆

ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت پر مصور اپنا نام، عمر، کلاس اور پورا پتا لکھے اور سکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹریس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔

دسمبر کا موضوع
مزار قائد اعظم
آخری تاریخ 8 دسمبر

جنوری کا موضوع
روضۂ رسولؐ
آخری تاریخ 8 جنوری